یکم و ۱۶ اگست ۲۰۲۶ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۹۔ شمارہ نمبر: ۱۵۔۱۶

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر:
سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمودالحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۹۲۔۲۱)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

نئے مشرقِ وُسطیٰ کا ایرانی تصوّر

محمد جواد ظریف

امریکا نے ایران پر حملے پھر شروع کر دیے ہیں۔ سوئٹزر لینڈ میں ایران اور امریکا کے درمیان مفاہمت کی یادداشت پر دستخط کیے گئے تھے جو مخدوش نوعیت کا تھا اور اب وہ غیر موثر ہو چکا ہے۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ۸ جولائی کو کہا کہ میرے نزدیک مفاہمت کی یہ یادداشت ختم ہو چکی ہے اور یہ کہ اب میں ایران سے مزید کوئی ڈیل نہیں کرنا چاہتا۔

امریکا ایران سمجھوتے کا زوال پذیر ہونا حیرت انگیز نہیں۔ اس سمجھوتے کو فریقین اپنے اپنے مفادات کی روشنی میں بیان کرتے رہے تھے، بالخصوص آبنائے ہرمز کے حوالے سے۔ ایران نے ابتدائی طور پر ۶۰ دن کے لیے آبنائے ہرمز سے تجارتی جہازوں کے بحفاظت گزرنے کو ممکن بنانے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ اس کے لیے کوئی چارجز نہیں لیے جانے تھے۔ امریکا اور خلیجی ریاستوں نے یہ تصور کر لیا تھا کہ ایران نے آبنائے ہرمز سے تمام ہی تجارتی جہازوں کے کسی بھی طرح کے چارجز لیے بغیر گزرنے کی منظوری دے دی تھی اور امریکا یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اُسے ایران کی طرف سے کیے جانے والے کسی بھی انتظام کا احترام کرنے کی ضرورت نہیں۔ اِس طرح کی کوئی بھی ڈیل کبھی کام نہیں کر سکتی۔ امریکا اور ایران کے درمیان دوبارہ عسکری قوت کے استعمال کے معاملے کو خارج از امکان قرار دینا انتہائی دشوار ہو گیا۔

ایک سامنے کی حقیقت یہ ہے کہ جنگ کو جاری رکھنا امریکا کے مفاد میں ہے نہ ایران کے۔ ایران کی فوج اور عوام نے دو ایٹمی قوتوں کی طرف سے تھوپی جانے والی جنگ ڈٹ کر لڑی ہے مگر خیر اِس کے باوجود وہ چاہتے ہیں کہ یہ تھوپی ہوئی جنگ ختم ہونی چاہیے۔ ایرانی عوام کسی بھی حال میں جنگ نہیں چاہتے تھے۔ اس دوران امریکا خود کو اپنے بنیادی اسٹریٹجک مقصد سے دور کر رہا ہے۔ ایک عشرے سے بھی زائد مدت کے دوران امریکا میں قائم ہونے والی حکومتوں نے اپنی توجہ مشرقِ وسطیٰ سے ہٹا کر بحر ہند کے خطے پر مرکوز کرنے کو ترجیح دی ہے تاکہ چین کے بڑھتے ہوئے اسٹریٹجک اثر و رسوخ کو کم کیا جا سکے۔ واشنگٹن کے پالیسی ساز اب مشرقِ وسطیٰ کو ایک طرف ہٹا کر جنوب مشرقی ایشیا اور اوشیانا کی طرف زیادہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

ایران سے سابق (۲۰۱۵ء کا) امریکی معاہدہ، دراصل اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ بات تو اب بہت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ امریکا چاہے کوئی بھی ہتھکنڈا اختیار کرے، ایرانی حکومت ختم نہیں کر سکتا۔ اب صرف سفارت کاری، امن معاہدے اور علاقائی ریاستوں کے ساتھ مل کر سکیورٹی کا ایک نیا ڈھانچا تیار کرنے کا آپشن رہ گیا ہے۔ ایسا کچھ ہونے کی صورت ہی میں علاقائی عرب ریاستیں یہ بات قبول کریں گی کہ امریکا کسی اور خطے کی طرف متوجہ ہو۔

گزشتہ برس کی عسکری محاذ آرائیوں نے ایران، اسرائیل اور امریکا کی صلاحیتوں کو آزمانے سے کچھ زیادہ کر دکھایا۔ ان محاذ آرائیوں نے مشرقِ وسطیٰ کے مستقبل، ڈیٹرنس اور جبر و استبداد سے متعلق طویل مدت سے چلے آ رہے مفروضوں کو چیلنج کیا۔ امریکا اور اسرائیل نے یہ سمجھا کہ طاقت کے استعمال سے ایران کو بہت سے معاملات میں موقف تبدیل کرنے پر راضی کیا جا سکتا ہے یا پھر اِس کے نتیجے میں اسلامی ریاست گر پڑے گی یعنی ایران میں سیکولر یا غیر اسلام نواز حکومت کا قیام ممکن ہو سکے گا۔ اندازے غلط ثابت ہوئے اور امریکا و اسرائیل نے ایران کے مقابل خود کو دلدل میں محسوس کیا۔ ایران کے خلاف غیر معمولی پیمانے پر طاقت استعمال کی گئی، بنیادی ڈھانچے کا بیڑا غرق کر دیا گیا مگر اِس کے باوجود ایرانی قیادت کو جھکنے پر مجبور نہیں کیا جا سکا۔ ایران کی علاقائی سالمیت بھی برقرار ہے اور سیاسی نظام بھی زوال سے دوچار دکھائی نہیں دے رہا۔ ثابت ہو گیا کہ ایرانی قوم انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنا دفاع کرنا بخوبی جانتی ہے۔

بیرونی قوتوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ایران کو کسی بھی طور محض طاقت کے استعمال کے ذریعے جھکنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ایران نے انتہائی نوعیت کی طاقت کے سامنے بھی ڈٹے رہنے کی صورت میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ خطے کے لیے مستقبل کے کسی بھی سکیورٹی سیٹ اپ سے ایران کو الگ نہیں رکھا جا سکتا۔

خلیج کے خطے سے تیل اور دیگر اشیا کی مختلف خطوں کو ترسیل کے حوالے سے ایران کے کردار کو کسی بھی حال میں

اندرونی صفحات پر

- خلیج کا مسئلہ اور چین
- نوجوانوں کی نئی کاکروچ جمہوریت
- غزہ نسل کشی: بھارت کا گھناؤنا کردار
- میدانِ جنگ یا ٹیسٹنگ گراؤنڈ؟
- سوئیڈن کو تو ہوش آ گیا
- جموں و کشمیر اور جزائرِ اولند

نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آبنائے ہرمز کی بندش کے ذریعے ایران نے مغرب کے تجزیہ کاروں پر واضح کر دیا کہ ایران ایک ایسی قوت ہے جو معاشی معاملات میں اپنا کردار پوری قوت کے ساتھ اور خاصے مخاصمانہ انداز سے منوانا چاہتا ہے۔ وہ تیل اور گیس کی عالمی منڈی میں ہلچل پیدا کرنے کی صلاحیت اور خواہش رکھتا ہے۔ ایران نے توانائی کی منڈیوں کو صرف ایک اسٹریٹجک مقصد کے تحت اکھاڑ پچھاڑ سے دوچار کیا ہے۔۔۔ یہ کہ امریکا اور اُس کے پارٹنر ایران کو تباہ کرنے کی مہم سے باز آ جائیں۔

حالیہ جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ سلامتی کے حوالے سے ایران کے لیے اب آبنائے ہرمز رگِ جاں کا درجہ رکھتی ہے۔ فروری میں بہت بڑے پیمانے پر مخاصمت کے آغاز سے قبل ایران نے امریکی اقتصادی پابندیوں کے باوجود آبنائے ہرمز سے تجارتی جہاز رانی کو قبول کر رکھا تھا۔ اس سے امریکا اور اُس کے پارٹنرز یہ سمجھ بیٹھے کہ ایران آبنائے ہرمز تک رسائی نہیں رکھتا، اُسے بند کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ امریکا کی اقتصادی پابندیوں نے آبنائے ہرمز کو ایرانی جہاز رانی کے لیے بند کر دیا تھا اور باقی تمام ہی علاقائی ممالک کے لیے کھلا رکھا تھا۔ امریکا اور اسرائیل کے حملوں سے ایرانی فوج اور قوم، دونوں ہی کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور اب وہ صورتِ حال کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اب ایران آبنائے ہرمز کے ذریعے اپنی بقا یقینی بنانا چاہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ راہداری کھلی رہے گی تو دنیا بھر میں تجارتی اور بالخصوص توانائی کی منڈیاں اپنی رفتار کے ساتھ کام کرتی رہیں گی۔ ان منڈیوں کو اکھاڑ پچھاڑ سے دوچار کرنے کی ایک ہی صورت بچی ہے۔۔۔ یہ کہ آبنائے ہرمز کو بند کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یمن بھی باب المندب کی تجارتی راہداری کو بند کرنے کی راہ پر گامزن ہے۔ اب ایران اس بات کو یقینی بنانا چاہتا ہے کہ اُس کے دشمن آبنائے ہرمز کے ذریعے اپنے آپ کو بھرپور استحکام سے ہمکنار نہ کریں، مزید حملوں کی تیاری نہ کریں اور ایران کے وجود کے لیے خطرہ نہ بنیں۔ اب تجارتی اور عسکری جہاز رانی کے درمیان پایا جانے والا فرق ختم ہو چکا ہے۔ امن کے زمانے میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ جنگ کے زمانے میں نہیں ہوتا۔ حالتِ جنگ میں بین الاقوامی قانون بھی قومی قانون کے تابع دکھائی دیتا ہے۔ ایران کا موقف یہ ہے کہ اگر امریکا خطے میں امن چاہتا ہے تو اُسے اسرائیل کے کردار پر بھی نظرِ ثانی کرنا ہوگی۔

ایران اب اس یقین اور نظریے کے ساتھ کام کر رہا ہے کہ اگر سمندری راستے دشمنوں کو مضبوط ہونے کا موقع فراہم کر رہے ہوں تو اُن کے معاملے میں غیر جانبدار نہیں رہا جا سکتا۔ ہتھیاروں کی سپلائی روکی جا سکتی ہے۔ تیل اور گیس کی رسد پر بھی پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ امریکا اور اُس کے علاقائی پارٹنرز کو لاجسٹک سپورٹ درکار ہے مگر اِس کی راہ میں بھی دیوار کھڑی کی جا سکتی ہے۔ ایران کی نئی ڈاکٹرائن یہ ہے کہ آبنائے ہرمز سے گزرنے والے ہتھیار اور ٹیکنالوجی بعد میں ایران پر حملوں کے لیے استعمال ہونی ہوں تو ایرانی پالیسی ساز ترسیل روکنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کا حق رکھتے ہیں۔ ایران کے لیے یہ معلوم کرنا انتہائی دشوار ہے کہ کن جہازوں میں تجارتی مال ہے اور کن میں ہتھیار یا جنگی ساز و سامان۔ ایسے میں اُس کے پاس ایک آسان اور قابلِ عمل آپشن یہ رہتا ہے کہ وہ آبنائے ہرمز کو مکمل طور پر بند کر دے۔ خلیجِ فارس کے خطے میں سمندری نقل و حرکت اور نقل و حمل کو مسلح تصادم کے اصولوں اور قوانین کی روشنی میں سمجھنا ہوگا اور اسٹریٹجک ارادوں کو بھی سمجھنا ہوگا۔

اب بھی ایران کے لیے آبنائے ہرمز کے ذریعے پیدا ہونے والا لیوریج بہت نازک ہے۔ اگر ایران بار بار آبنائے ہرمز کو بند کرتا رہے تو پھر پوری دنیا اُس کے خلاف ہو سکتی ہے۔ اگر اُس نے آبنائے ہرمز کو مستقل طور پر بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تو متبادل آبی راستوں کی تیاری کے لیے سرمایہ کاری میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور یہ کیفیت ایران کے خلاف جائے گی۔ اگر باقی دنیا نے متبادل راستوں کے ذریعے جہاز رانی کی راہ منتخب کی تو ایران کے لیے آبنائے ہرمز کو ڈیٹرنٹ کے طور پر استعمال کرنا ممکن نہ رہے گا اور ایسے میں آبنائے ہرمز کی بندش اُس کے لیے کسی بھی نوعیت کے فائدے یا ایڈوانٹیج کا ذریعہ نہ رہے گی۔ ایسے میں ایران کے پاس ایک اچھا آپشن یہ ہے کہ وہ آبنائے ہرمز کی بندش کے آپشن کو احتیاط سے استعمال کرے۔ ساتھ ہی ساتھ دوسرے ممالک کو بھی ایران کے ہر طرح کے مفادات کے خلاف کوئی دیوار کھڑی کرنے سے گریز کرنا ہوگا۔ ایران پر مزید اقتصادی پابندیاں بھی نافذ کی جا سکتی ہیں تاکہ وہ نیوی گیشن کی آزادی سے زیادہ بہرہ ور نہ ہو۔ اس کے خلاف سفارت کاری کے محاذ پر زیادہ کامیابی ممکن ہو سکے گی اور یوں ایران کے خلاف استعمال ہونے والے ہتھیار، گولا بارود اور جنگی ساز و سامان کی آبنائے ہرمز کے ذریعے ترسیل بھی ممکن ہو سکے گی۔

خلیج کے خطے میں سلامتی یقینی بنانے کے لیے لازم ہے کہ خطے کی تمام ساحلی ریاستوں پر مشتمل علاقائی سکیورٹی نیٹ ورک قائم کیا جائے جو تمام ریاستوں کے درمیان مکالمے اور اشتراکِ عمل کے ذریعے اعتماد کی فضا پیدا کرنے کے لیے کام کرے۔ یہ سوچ خطے میں عدم استحکام پیدا کرنے والی عسکری موجودگی کا گراف نیچے لائے گی اور بیرونی قوتوں کی عسکری مہم جوئی کی راہ مسدود کرنے میں بھی غیر معمولی حد تک معاون ثابت ہوگی۔ یہ قوتیں علاقائی ریاستوں کی ضرورت ہیں جنہیں ایران کے خلاف ڈیٹرنٹ کی ضرورت ہے۔ مفاہمت کی یادداشت کے مطابق ایران اور عمان کلیدی علاقائی سطح پر سلامتی یقینی بنانے میں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ دیگر خلیجی ریاستوں کو بھی ساتھ ملا کر آبنائے ہرمز کے ذریعے جہاز رانی کو بین الاقوامی قانون کے ماتحت کر سکتے ہیں۔ علاقے کی تمام ریاستیں آبنائے ہرمز سے مستفید ہونے کا حق محفوظ رکھتی ہیں۔

آبنائے ہرمز اب بھی ایک اہم فلیش پوائنٹ ہے یعنی اِس کی بنیاد پر کسی بھی وقت کوئی بڑی معرکہ آرائی شروع ہو سکتی ہے۔ خیر، ایران اور امریکا کے درمیان کشیدگی محض آبنائے ہرمز کی بنیاد پر نہیں۔ لڑائی روکنے کے لیے لازم ہے کہ ایران اور امریکا اپنے وسیع تر اختلافات کو ختم کرنے یا کنٹرول کرنے کی طرف مائل ہوں اور اِس حوالے سے سنجیدہ اور بامقصد کوششیں کی جانی چاہئیں۔

یہ حقیقت تسلیم کی جانی چاہیے کہ ایران اور امریکا دوست نہیں ہو سکتے مگر خیر، بات چیت کے ذریعے دونوں اپنی اپنی طرف سے مخاصمت کا گراف تو نیچے لا ہی سکتے ہیں۔ ایران کے سپریم لیڈر علی خامنہ ای اور اسکولوں کے بچوں کے قتل نے ایران کے زخم تازہ اور مزید گہرے کر دیے ہیں۔ یہ زخم کبھی بھریں گے نہیں اور بھلائے بھی نہیں جا سکیں گے تاہم انہیں لڑائی کے تسلسل کا ذریعہ نہیں بننے دینا چاہیے۔ یہ بات یقینی بنائی جانی چاہیے کہ مستقبل کی سفارت کاری حقیقت پسندی کے ساتھ جاری رکھی جائے۔ ایران اور امریکا کے درمیان تنازعات کبھی کبھی بنیادی شناخت سے متعلق اختلافات کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس لیے ایسا مکالمہ لازم ہے جس کے تحت دونوں ممالک اپنے اپنے ذہن واضح کریں۔ دونوں ملکوں کے کشیدہ تعلقات کبھی کبھی باہمی شکوک و شبہات کا نتیجہ ہوتے ہیں جن کے تحت ٹیکٹیکل مفادات کو اشتراکِ عمل پر ترجیح دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ پالیسی سے متعلق ایسے اشوز پر مبنی ہوتے ہیں

جن پر بات ہوسکتی ہے اور سودے بازی بھی کی جاسکتی ہے، کچھ دو اور کچھ لو کی بنیاد پر بہت کچھ طے کیا جاسکتا ہے۔ اگر امریکا اور ایران کو آگے بڑھنا ہے تو انہیں اپنی بقا سے متعلق اقدار اور مشترکہ اقدار میں تمیز کا شعور پیدا کرنا ہوگا۔ دونوں ملکوں کو ایسے مقاصد کا تعین کرنا ہوگا جن پر سمجھوتا یا سودے بازی ممکن ہے۔ ہر فریق کو دوسرے فریق پر بالا دستی یا برتری یقینی بنانے کی فضول کوشش سے گریز کرنا ہوگا۔

اگر امریکا اور ایران حقیقی یا حقیقت پسندانہ سکیورٹی ارینجمنٹ چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ایسا پالیسی فریم ورک اپنائیں جس میں جارحیت کے لیے کوئی جگہ نہ ہو۔ شناخت سے متعلق تنازعات کو تصادم اور تشدد تک پہنچنے سے ہر قیمت پر روکنا ہوگا۔ اِسی صورت تہران اور واشنگٹن اپنے اپنے چیلنجوں کے حوالے سے رابطہ کاری ممکن بناسکیں گے۔ افغانستان میں استحکام پیدا کرنا، منشیات کی اسمگلنگ کی روک تھام اور نقل مکانی پر قابو پانا ایسے مقاصد ہیں جن کے حوالے سے دونوں ملک مل کر کام کر سکتے ہیں۔ امریکا ایرانی ریاست کی سالمیت تسلیم کرے گا، ایرانی حکومت اور اُس کے اداروں پر سے دہشت گردی کی ٹیگ ہٹائے گا اور تمام پابندیاں حتمی اور دائمی طور پر ختم کرے گا۔ واشنگٹن کے لیے لازم ہے کہ حالیہ جنگ کے دوران بلادریغ حملوں سے ایران کا جو نقصان ہوا ہے، اُس کا ازالہ کرے۔ ایک یادداشت میں اُس نے وعدہ کیا ہے کہ ایران کو تعمیرِ نو کے لیے ۳۰۰/ارب ڈالر کا پیکیج دے گا۔ اس کے جواب میں ایران ایٹمی عدم پھیلاؤ کے لیے راضی ہوگا اور ضمانت بھی فراہم کرے گا۔ وہ ایٹمی توانائی کے عالمی ادارے کے اضافی پروٹوکول کی تصدیق پر راضی ہوگا۔ اس کے تحت ایٹمی توانائی کے عالمی ادارے کے انسپکٹرز کو ایران کی ایٹمی تنصیبات کے معائنے کی اجازت ہوگی۔ ایران اپنے سابق سپریم لیڈر علی خامنہ ای کا ایٹمی ہتھیاروں سے متعلق فتویٰ واپس لے سکتا ہے۔

اگر امریکا واقعی امن چاہتا ہے تو اُسے اسرائیل کے کردار کو بغور دیکھنا ہوگا۔ جون ۲۰۲۵ء میں اسرائیل نے ایران کے خلاف پہلی جنگ چھیڑی۔ اس سے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ پر دباؤ پڑا کہ امریکا دوسری جنگ میں شریک ہو یعنی اسرائیل کا ساتھ دے۔ اسرائیل میں بننے والی حکومتوں نے مشرقِ وسطیٰ میں امن و استحکام کی بحالی سے متعلق امریکی کوششوں کی بھرپور مخالفت کی ہے۔ وہ ۲۰۱۵ء میں طے پانے والے چھ فریقی ایٹمی معاہدے کا بھی مخالف رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اسرائیلی حکومت ایران اور امریکا کے درمیان طے پانے والی حالیہ یادداشت کی بھی مخالفت کرتی رہی ہے۔ اگر امریکا چاہتا ہے کہ کسی نئے تصادم کی راہ روکی جائے تو اُسے امن خراب کرنے والے فریق یعنی اسرائیل کو روکنا ہوگا کیونکہ وہ ہر حال میں لڑائی جاری رکھنا چاہتا ہے۔ اس معاملے میں وہ اپنے نقصان کی بھی پروا نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ امریکا کے مفادات کے منافی ہے۔ اسرائیل کی طرزِ فکر و عمل نہ صرف یہ کہ ایران سے امن کی راہ روکتی ہے بلکہ پورے مشرقِ وسطیٰ کو عدم استحکام سے دوچار بھی رکھتی ہے۔ مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں یہودیوں کی آبادکاری جاری رکھ کر، غزہ میں قتلِ عام کے ذریعے، لبنان کی تباہی کی صورت میں اسرائیل نے بار بار یہ دکھادیا ہے کہ وہ پورے خطے کو اپنی عسکری برتری کے حصار میں لینے کے لیے مکمل انتشار پیدا کرنا چاہتا ہے۔

امریکا اور اُس کے پارٹنرز کے لیے لازم ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں مستقل عدمِ استحکام کے ذریعے سے نپٹیں۔ مفاہمت کی حالیہ یادداشت کے پہلے پیراگراف میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ اور اُن کے نائب جے ڈی وینس نے لبنان کی علاقائی سالمیت اور خودمختاری کے حوالے سے کمٹمنٹ کی ہے۔ دوسری طرف امریکا کے وزیرِ خارجہ مارکو روبیو نے گزشتہ ماہ خطے کے دورے کے ذریعے ایک مہم شروع کی ہے جس کے تحت لبنان پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ وہ اسرائیل سے یک طرفہ معاہدہ کرلے جبکہ اسرائیل نے اب تک لبنان کے کئی علاقوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھا ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ فلسطینیوں کی شدید نوعیت کی مشکلات کے حوالے سے مستقل مزاجی نہیں دکھاپائی اور اب تک شدید بے حسی کا مظاہرہ کررہی ہے۔ یہ سب کچھ ختم ہونا چاہیے۔ امریکا کو اب اسرائیل پر زیادہ اور بھرپور دباؤ ڈالنا چاہیے۔

تہران اور واشنگٹن کے درمیان امن معاہدے کی کامیابی کی راہ مسدود کرنے والا اسرائیل واحد عامل نہیں۔ ایران اور خلیجِ فارس میں اُس کے ہمسایوں کو بھی مل کر کوئی ایسا منصوبہ تیار کرنا چاہیے جس سے خطے میں عشروں پر محیط کشیدگی کا خاتمہ ہو۔ یہ سب کچھ ۱۹۸۰ء میں ایران عراق جنگ کے نتیجے میں شروع ہوا تھا۔ تب پیدا ہونے والی کشیدگی اور بے امنی اب تک برقرار ہے۔ یہ کسی کے بھی مفاد میں نہیں۔ اِس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کو سکیورٹی کے ایسے ماڈل سے دوری اختیار کرنی چاہیے جس میں بیرونی قوتوں کا کلیدی کردار ہو۔ اس رجحان نے امریکا کو خطے میں فوجی، ہتھیار اور جنگی ساز و سامان لانے کی تحریک دی ہے۔ اِس کے نتیجے میں تنازع برقرار رہا ہے۔ بیرونی قوتوں کی بنیاد پر لشکر کشی ہمیشہ خطرناک ثابت ہوئی ہے۔ حالیہ کشیدگی نے اِسے اور واضح کردیا ہے۔ سکیورٹی کے معاملے کو عالمی طاقتوں کو آؤٹ سورس کرنا مسائل کا حل نہیں۔ معیشت کی سطح پر ترقی تو بہت دور کا معاملہ رہا، ایسا کوئی بھی انتظام سکیورٹی کی ضمانت بھی نہیں دے سکتا۔

مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کو بیرونی قوتوں پر انحصار کرنے کے بجائے باہم مربوط ہوکر کام کرنا چاہیے تاکہ کسی ایک ملک کا استحکام اُس کے ہمسایوں کے لیے بھی استحکام کا ذریعہ ثابت ہو۔ اِس نوعیت کے کسی بھی نظام کے لیے ایران نے کئی طرح کے بلڈنگ بلاکس تجویز کیے ہیں۔ میں نے ۲۰۲۴ء میں نائب صدر کی حیثیت سے اس بات پر زور دیا تھا کہ خطے کے تمام ممالک اداروں کی سطح پر رابطے کریں، گفت و شنید کے مرحلے سے گزریں تاکہ باہمی احترام، عدم مداخلت، عدمِ جارحیت کی راہ ہموار ہو۔ اِس میں اعتماد سازی کے اقدامات شامل ہوں گے مثلاً شورش زدہ علاقوں میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کام کرنا، انسدادِ دہشت گردی کے لیے مل کر کام کرنا، پُرامن بقائے باہمی یقینی بنانے کے لیے میڈیا پر مشترکہ مہمیں چلانا۔ میں نے ایٹمی توانائی کا پرامن استعمال یقینی بنانے کے لیے ریجنل نیوکلیئر نیٹ ورک کے قیام کی بھی حمایت کی تھی۔ اس میں ماہرین شامل ہوں گے جو فطری علوم و فنون کے شعبے میں اشتراکِ عمل کو فروغ دینے کی کوشش کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقینی بنایا جائے گا کہ کوئی بھی علاقائی ملک ایٹمی ہتھیار بنانے کی طرف نہ جائے۔ امریکا، چین اور روس مل کر مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے لیے ایک ایسا کنسورشیم قائم کرسکتے ہیں جو خالص سویلین مقاصد کے لیے ایٹمی توانائی کا حصول اور اُس کا بروئے کار لایا جانا ممکن بنائے۔ آگے چل کر ایسے کسی بھی کنسورشیم کو مشرقِ وسطیٰ کے لیے ایٹمی توانائی کے واحد ادارے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کسی ایک ملک کی کامیابی خطے کے دیگر ممالک کے لیے بھی کارآمد ہو، مشرقِ وسطیٰ کی حکومتوں کو باہم مربوط علاقائی اقتصادی ایکو سسٹم قائم کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر شورش زدہ علاقوں کی تعمیرِ نو، صحتِ عامہ، تعلیمِ عامہ اور بنیادی ڈھانچے کے لیے خصوصی فنڈ قائم کیا جاسکتا ہے۔ ریلوے، تیل اور گیس کی پائپ لائنز، ڈیجیٹل انفرا اسٹرکچر اور سمندری راستوں کے ذریعے علاقائی

سطح پر تمام ممالک کو آپس میں جوڑا جا سکتا ہے۔ یوں سرمائے اور مصنوعات کی ترسیل اور نقل و حمل آسان بنائی جا سکتی ہے۔ ماحول کی گراوٹ اور پانی کی شدید قلت تمام ہی علاقائی ممالک کے لیے بنیادی چیلنجوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ اِس سلسلے میں اداروں کی سطح پر اشتراکِ عمل ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

اگر مشرقِ وسطیٰ بامعنی مشترکہ ادارے قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ بے مثال انداز سے ترقی و خوشحالی ممکن بنا سکتا ہے۔ اِس کے پاس قدرتی وسائل کی کمی نہیں۔ تہذیبی ورثہ بھی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ آبادی میں پڑھے لکھے نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ایران رقبے کے لحاظ سے بڑا ملک ہے۔ یہ فطری علوم و فنون میں غیر معمولی پیشرفت کا حامل ہے۔ اِس کی افرادی قوت عالمی معیار کی ہے۔ عرب ریاستیں مالیات اور سرمایہ کاری کے محاذ پر خوب کام کر سکتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ سرمائے کی مینجمنٹ بھی مہارت سے کرتی ہیں۔ خطے کو مضبوط بنانے اور پروان چڑھانے میں صنعتی اور جیو پولیٹیکل سطح پر پاکستان اور ترکی بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

عشروں کی بے اعتمادی کو دیکھتے ہوئے بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ایسا آسان نہ ہوگا جیسا دکھائی دیتا ہے مگر اِس کے باوجود خطے کو پُرتشدد ماضی کا غلام نہیں ہونا چاہیے۔ حالیہ لڑائیوں نے واضح کر دیا ہے کہ طاقت کا استعمال شدید جانی و مالی نقصان کا باعث بنتا ہے اور یہ بھی کہ طاقت کے استعمال سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا۔ واشنگٹن اور عرب ریاستوں کو ہی تسلیم کرنا ہوگا کہ دنیا کے نقشے پر ایران ایک اہم مقام کا حامل ہے اور اُسے نظر انداز کرکے، الگ تھلگ رکھ کر خطے کے ممالک استحکام یقینی نہیں بنا سکتے۔ ساتھ ہی ساتھ ایران کو نئے حاصل شدہ اعتماد کے ساتھ اپنے ہمسایوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہیے اور ڈیٹرنس کے ساتھ ساتھ باہمی تعاون کے ذریعے بھی سکیورٹی یقینی بنانی چاہیے۔ پوری دنیا کو یہ بات سمجھنا ہوگی کہ مشرقِ وسطیٰ کے لیے پائیدار استحکام درآمد کیا جا سکتا ہے نہ تھوپا جا سکتا ہے۔ یہ تو خطے کے لوگوں اور ریاستوں ہی کو یقینی بنانا ہے۔

محمد جواد ظریف ایران کے سابق وزیرِخارجہ ہیں۔ وہ تہران یونیورسٹی میں گلوبل اسٹڈیز کے پروفیسر اور Possibilities Architects کے بانی صدر ہیں۔ وہ ایران کے نائب صدر اور اقوامِ متحدہ میں ایران کے مستقل مندوب بھی رہے ہیں۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"An Iranian vision of the new Middle East".
("Foreign Affairs". July 20, 2026)

* * *

خلیج کا مسئلہ اور چین

Mohammed Alsudairi, Andrea Ghiselli, and Aaron Glasserman

ایران امریکا جنگ نے خلیجِ فارس کے پورے خطے کو شدید عدمِ استحکام سے دوچار کر دیا ہے۔ عرب ریاستیں امریکا سے تعلق کے حوالے سے شدید بدحواسی کا شکار ہیں۔ امریکا نے ایران پر جو لشکر کشی کی اُس کے نتیجے میں توانائی کی عالمی منڈی میں شدید عدم استحکام پیدا ہوا۔ ایران کی جوابی کارروائیوں سے خلیجی یا عرب ریاستوں کو محفوظ رکھنے میں امریکا بری طرح ناکام رہا ہے۔ خیر، یہ جنگ خلیجی ریاستوں کو چین سے اپنے تعلقات پر نظرِ ثانی پر بھی مجبور کر رہی ہے۔ ایران کو پڑوسی عرب ریاستوں پر حملوں سے باز رکھنے کے معاملے میں چین کی انتظار کرو اور دیکھو کی پالیسی نے خطے کے ممالک کو مایوس کیا ہے اور وہ مستقبلِ قریب میں کسی بڑے اور جامع دفاعی معاہدے کے حوالے سے چین سے شراکت کے امکان پر زیادہ غور نہیں کر رہے۔

چند حالیہ برسوں کے دوران خلیجی ریاستوں نے چین کو خطے میں ایک بڑی، ابھرتی ہوئی طاقت کے روپ میں دیکھا تھا۔ ۲۰۲۳ء میں چین کی ضرورت کا ۳۶ فیصد تیل سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، کویت، قطر، عمان اور بحرین سے گیا۔ ۲۰۲۴ء میں چین سے خلیجی ممالک کی تجارت کم و بیش ۳۰۰؍ارب ڈالر تک جا پہنچی۔ یہ حجم امریکا اور یورپ سے کی جانے والی تجارت کے مجموعی حجم سے زیادہ تھا۔ خطے کے ممالک کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ جب اتنے بڑے پیمانے پر تجارت ہو رہی ہے تو چین لازمی طور پر چاہے گا کہ خطے کو سلامتی کے حوالے سے مستحکم رکھنے کی خاطر ایران کو کسی بھی نوعیت کی عسکری مہم جوئی سے دور رکھنے پر غیر معمولی توجہ دے گا۔

خلیجی ریاستوں میں یہ تاثر اور تصور پروان چڑھ رہا ہے کہ حالیہ ایران جنگ سے قبل چین پورے خطے کو محفوظ رکھنے کے حوالے سے جتنا سنجیدہ تھا اب اُتنا سنجیدہ بھی نہیں رہا۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ قرار دیا جا رہا ہے کہ چین عالمگیر نوعیت کی سلامتی کے حوالے سے گہری، وسیع اور مبسوط سوچ اپنانے کا خواہش مند نہیں ہے۔ ایران امریکا جنگ کے نتیجے میں خطے میں جو انتشار پھیلا ہے اُس نے چین کو کسی بھی مسلح تصادم یا مناقشے میں الجھنے کے حوالے سے مزید محتاط کر دیا ہے جبکہ اِس سے پہلے بھی وہ سلامتی کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریزاں رہا ہے۔ اب تک وہ کسی بھی خطے میں جاری تصادم کا مناقشے میں فریق بننے سے واضح طور پر گریز کی راہ پر گامزن رہا ہے۔ خلیج کے خطے میں چین کی تجارت بھی بڑھ رہی ہے اور سرمایہ کاری کی سطح بھی بلند ہو رہی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ خطے کے ممالک میں یہ احساس بھی زور پکڑ رہا ہے کہ چین اُن کی سلامتی کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریزاں رہنے کی پالیسی پر ہی کاربند رہے گا۔ وہ اِس معاملے میں واشنگٹن کے مقابل آنے سے بچنا چاہتا ہے۔ خطے کے ممالک کو اب اپنی سلامتی یقینی بنانے کے حوالے سے امریکا سے دور ہٹنا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ انہیں اپنی سلامتی کے حوالے سے نئے پارٹنرز تلاش کرنا ہوں گے۔ تمنا اور امید تھی کہ چین ایک اچھا پارٹنر ثابت ہوگا مگر یہ تمنا اور امید بار آور ثابت نہ ہوئی۔

رواں عشرے کے اوائل میں خلیجِ فارس کے خطے میں چین کی موجودگی میں توسیع شروع ہوئی۔ تب بہت سی توقعات بھی وابستہ کر لی گئیں کہ اب وہ اِس خطے کے لیے بہت کچھ کرے گا۔ خطے کے بیشتر ممالک اگرچہ اپنی سلامتی کے حوالے سے امریکا ہی کی طرف دیکھ رہے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ انہیں یقین تھا کہ اب چین بھی اِس معاملے میں کچھ نہ کچھ کرنے پر متوجہ ہوگا۔ چین خلیج کے تیل اور سرمائے پر بہت زیادہ انحصار کر رہا تھا اور اِسی حقیقت کی بنیاد پر خلیجی ریاستوں کو یقین تھا کہ اب بیجنگ خطے کی سلامتی یقینی بنانے میں زیادہ دلچسپی لے گا۔ حالیہ ایران جنگ کے آغاز سے قبل فروری میں خلیجی مجلسِ تعاون کے ارکان چین کو یومیہ ۴۰ لاکھ بیرل سے بھی زائد تیل فراہم کر رہے تھے۔ خطے کے ساورن ویلتھ فنڈز چین میں بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر رہے تھے اور بیجنگ، ہانگ کانگ اور شنگھائی میں دفاتر کھولے جا رہے تھے۔ خلیج کے متعدد ممالک نے قابلِ تجدید توانائی اور خلائی ٹیکنالوجی جیسے اہم شعبوں میں تعاون اور اشتراکِ عمل کے لیے چین سے کئی معاہدے کیے۔ جزیرہ نمائے عرب میں چینیوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی جو اب کم و بیش ۵ لاکھ ہو چلی تھی۔

تہران میں بھی چین کا اثر و رسوخ غیر معمولی تھا اِس لیے اُمید کی جا رہی تھی کہ بیجنگ کے ذریعے تہران کو پڑوسی ملکوں

میں حالات خراب کرنے سے باز رکھنے میں مدد مل سکے گی۔ امریکا کی طرف سے تھوپی جانے والی اقتصادی پابندیوں کے باعث ایران معاشی اور سفارتی امداد کے معاملے میں بہت حد تک چین پر انحصار پذیر تھا۔ ۲۰۲۱ء میں تعاون کا پچیس سالہ معاہدہ ہوا جس کے تحت چین نے ایران میں بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری پر آمادگی ظاہر کی۔ ایران میں چین کی بڑھتی ہوئی طاقت ہی وہ بنیادی عامل تھا جس نے ۲۰۲۳ء میں ایران اور سعودی عرب کے درمیان معاہدے کی راہ ہموار کی اور چین نے اس میں ضامن کا کردار ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اور یوں ایران اور سعودی عرب کے درمیان سفارتی تعلقات کی بحالی ممکن ہوسکی۔ چین، ایران اور سعودی عرب نے آپس میں تین میٹنگز کیں اور اِن میں سے آخری دسمبر ۲۰۲۵ء میں تہران میں ہوئی۔ یہ خطے میں سفارتی سطح کے سب سے پُرامید لمحات میں سے تھا۔

چین کی حکومت جو کچھ کہہ رہی تھی اور کر رہی تھی اُس سے یہ امید غیر معمولی حد تک توانا ہو چلی کہ اب وہ خلیج کے خطے کا ایک بڑا اسکیورٹی اسٹیک ہولڈر بنے گا۔ عرب اسپرنگ کے ایک عشرے کے بعد، جس کے دوران مشرقِ وسطیٰ پراکسیز کی شدید جنگ میں الجھا رہا، چین نے نئی نسل کے پالیسی میکرز اور اصلاح پسندوں میں اپنے لیے ایک اچھا موقع دیکھا۔ خلیج کے بیشتر قائدین نے معاشی نمو کے لیے نئے ذرائع کی طرف دیکھنے اور تیل کی بنیاد پر چلائی جانے والی معیشت کا ڈھانچا بدلنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنے پڑوسیوں سے تعلقات بہتر بنانے کی بھی تیاریاں شروع کیں۔ چین بھی یہی چاہتا تھا کیونکہ اُسے خلیج کی شکل میں ایک ایسا خطہ درکار تھا جو معاشی طور پر مضبوط اور سلامتی کے اعتبار سے مستحکم ہو۔ وہ اس سلسلے میں تعاون اور اشتراکِ عمل کے لیے تیار تھا۔

چین کے میڈیا نے خلیج کے قائدین کے بارے میں مضامین شائع کرنا شروع کیا۔ اِن میں سعودی ولی عہد محمد بن سلمان بھی شامل تھے جنہیں چینی میڈیا نے چینی انداز کی جدت طرازی کا دلدادہ قرار دیا۔ چین نے خلیج کے ممالک سے سفارتی تعلقات کی سطح کو بلند بھی کرنا شروع کیا۔ چین کے لیڈر شی جن پنگ نے ۲۰۲۲ میں سعودی دارالحکومت ریاض میں پہلی چین عرب سربراہ کانفرنس اور چین و خلیجی مجلسِ تعاون کی مشترکہ سربراہ کانفرنس میں شرکت کی۔ اِس دوران چین نے ایک مشترکہ بیان پر بھی دستخط کیے جس میں ایران کے زیرِ تصرف تین جزائر پر متحدہ عرب امارات کے دعوے کا ذکر تھا۔ مارچ ۲۰۲۳ میں چینی تجزیہ کاروں اور حکام نے سعودی عرب اور ایران کے درمیان مصالحتی عمل کا آغاز کیا تاکہ عشروں سے جاری تنازعات، جمود اور بے امنی کی راہ مسدود ہو سکے۔

خلیجی ریاستوں کا یہ بھی خیال تھا کہ خطے میں چین کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے امریکا بھی اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کرے گا اور یوں اُس کی طرف اقتصادی امداد اور سلامتی سے متعلق رعایتیں حاصل کرنے میں آسانی رہے گی۔ چین کے ٹیلی کام جاینٹ ہواوے اب دبئی اور ریاض میں غیر معمولی حد تک آپریشنل ہے۔ امریکا نے چاہا کہ خلیجی و عرب ریاستیں چینی اداروں میں سرمایہ کاری گھٹائیں مگر ایسا ممکن نہ ہوسکا کیونکہ معقول و متناسب متبادل میسر نہ تھا۔ چین اور امریکا کے درمیان ٹیکنالوجی کے شعبے میں مسابقت بڑھ رہی تھی جس کے نتیجے میں یہ امید بجا طور پر کی جاسکتی تھی کہ امریکا اب خطے پر زیادہ توجہ دے گا۔ مئی ۲۰۲۵ میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے دورے کے بعد متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب نے امریکا کی ٹیکنالوجی کمپنی این وڈیا سے کمپیوٹر چپس خریدنے کا معاہدہ کیا۔ خلیجی ریاستیں اپنے خطے کو مصنوعی ذہانت کے پاور ہاؤس میں تبدیل کرنے کا سوچا۔ اِن ریاستوں کو یقین تھا کہ دو بڑے اور انتہائی طاقتور ممالک کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے نتیجے میں خطے کو اقتصادیات اور ٹیکنالوجیز کے شعبوں میں مضبوط بنانے میں مدد ملے گی۔

حالیہ تین برس کے دوران جو کچھ ہوا ہے اُس نے چین کے حوالے سے خلیجی ریاستوں کی امنگوں اور امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ اس حوالے سے سیاسی اور اسٹریٹجک امور کے ماہرین تبصرے بھی کرتے رہے ہیں اور تجزیے بھی قلم بند کرتے رہے ہیں۔ اکتوبر ۲۰۲۳ء میں اسرائیل پر حماس کے حملوں کے بعد چین نے خطے میں سیکیورٹی کے حوالے سے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ اپنے وعدوں پر قائم ہے۔ اِتنا ضرور ہے کہ چین نے خطے میں امن اور سلامتی یقینی بنانے کے لیے ثالث کا کردار ادا کرنے میں زیادہ دلچسپی لی ہے اور اُس نے جولائی ۲۰۲۴ میں فریقین کو مذاکرات کی میز پر لانے کی کوشش کی اور فلسطینی سیاسی جماعتوں کا ایک اجلاس بھی بلایا مگر اِس سے بھی کچھ نہ ہوا اور معاملہ جوں کے توں رہے۔ ۲۰۲۳ء کے اواخر میں یمن کے ایران نواز حوثی باغیوں نے بحیرۂ احمر میں تجارتی اور عسکری جہازوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ چین نے ایران پر زور نہیں دیا کہ وہ اپنی پراکسی ملیشیا کو جہاز رانی پر حملوں سے روکے۔ اِس کے بجائے اُس نے اپنے بحری جہازوں کی سلامتی یقینی بنانے کے لیے حوثیوں سے ایک خفیہ سمجھوتا کیا۔

رواں سال بھی جب امریکا اور ایران کی جنگ شروع ہوئی تب چین نے ایرانیوں کو خلیجی و عرب ممالک پر حملوں سے باز رکھنے کے حوالے سے کچھ نہیں کیا۔ دوسروں کے مقابلے میں سعودی عرب کو زیادہ شِکوہ رہا کیونکہ ایران سے سفارتی تعلقات کی بحالی کے حوالے سے چین نے ضامن کا کردار ادا کرنا قبول کیا تھا۔ ایران پر امریکی اور اسرائیلی حملوں کی حمایت سے چین اگرچہ باز رہا تاہم چند خلیجی ریاستوں نے ایرانی حملوں پر کوئی اعتراض نہ ہونے کا عندیہ دیا کیونکہ اُس نے سلامتی کونسل میں ایک قرارداد کو ویٹو کیا جس کے ذریعے آبنائے ہرمز میں جہاز رانی کو محفوظ بنانے پر زور دیا گیا تھا۔ اب یہ بات بھی بہت حد تک واضح ہوچکی ہے تو چینی کمپنیوں نے ایران کو جیو اسپٹیل انفارمیشن معلوم فراہم کیں تاکہ وہ خلیجی و عرب ریاستوں میں امریکی فوجی تنصیبات کو زیادہ درستی سے نشانہ بنا سکے۔

چین کا خطے کے معاملات میں مداخلت سے گریز ایک طرف حقیقت پسندی کا مظہر ہے اور دوسری طرف یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اسٹریٹجک معاملات میں اُس کی سوچ ایک خاص حد تک مفلوج ہے۔ عرب بہار اور اُس کے بعد کے برسوں میں داعش کا ابھرنے کے پیش منظر میں چین کے پالیسی ساز اور تجزیہ کار اس نکتے پر سیر حاصل بحث کر چکے ہیں کہ چین کو مشرقِ وسطیٰ میں اپنی طرزِ فکر و عمل کس طور بدلنی چاہیے۔ حکومت پالیسیوں کے ناقدین کا کہنا تھا کہ ایک بڑی طاقت ہونے کے ناطے چین کو اپنے مفادات کا تحفظ یقینی بنانے اور علاقائی سلامتی کا معاملہ مستحکم رکھنے کے لیے مزید بہت کچھ کرنا چاہیے۔ ہاں، وہ یہ بتانے سے قاصر رہے کہ اگر چین عسکری سطح پر آگے بڑھا تو اُس کی نئی حکمتِ عملی زمین پر کیسی دکھائی دے گی اور سعودی عرب یا کسی اور علاقائی ملک سے وسیع تر نوعیت کی پارٹنر شپ کو سنبھالنے کی قیمت کیا ہوگی اور کیا چین ایسی کوئی بھی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار بھی ہے یا نہیں۔ مشرقِ وسطیٰ ایک ایسا خطہ ہے جو مدتوں سے عدم استحکام کا شکار رہا ہے اور اِس میں بیرونی مداخلت بہت مہنگی ثابت ہوتی رہی ہے۔ ایسے میں چینی قائدین نے مناسب یہ جانا کہ کچھ نہ کیا جائے اور محض انتظار کیا جائے۔ چینی پالیسی سازوں نے قائدین کو خبردار بھی کیا کہ وہ محتاط رہیں کیونکہ یہ واضح نہیں کہ خطہ کس طرف جا رہا ہے۔ بیجنگ نے یہ محسوس کیا کہ ایران اور سعودی عرب کے سفارتی تعلقات کی بحالی کے لیے اُس نے جو کچھ کیا اُس نے

ایک ذمہ دار قوت کے طور پر اُس کی ساکھ بہتر بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا اور اِس میں کچھ خاص خرچ بھی نہیں کرنا پڑا۔ خیر، سب کچھ ایسا نہیں ہے۔ ۲۰۲۴ میں شام کے حکمران بشارالاسد کا دھڑن تختہ ہونے اور ۲۰۲۵ میں ۱۲ روزہ جنگ سے اس بات کا خدشہ زور پکڑ گیا کہ یہ خطہ شدید انتشار کی دلدل میں دھنس جائے گا۔ پھر یہ ہوا کہ رواں سال فروری میں امریکا اور اسرائیل نے ایران پر بمباری شروع کردی۔ بیجنگ نے پہلے سے کچھ خاص تیاری نہیں کی تھی کہ خطے میں اپنے معاشی اثاثوں کو کس طور محفوظ رکھا جائے اور کسی طویل عسکری مناقشے میں گھسیٹے جانے سے بچنے کے لیے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ اِس کے نتیجے میں چینی قیادت ہچکچاہٹ کا شکار ہوئی اور اُس نے پورے خطے کو ایرانی حملوں کے لیے انتہائی ہدف پذیر بنادیا۔

ایسا نہیں ہے کہ خلیجِ فارس کا خطہ چین کے حوالے سے مکمل مایوس ہوچکا ہے اور اُس کے ساتھ بالکل چلنا نہیں چاہتا۔ جن شعبوں میں واضح توقعات، ٹھوس مفادات اور محدود سیاسی خطرات کے ساتھ مل کر کام کرنا ممکن ہوگا اُن تمام شعبوں میں چین اور خلیجی مجلسِ تعاون کے ارکان کے درمیان اشتراکِ عمل جاری رہے گا۔ چین و خلیجِ فارس کے تعلقات میں توانائی کو بنیادی عامل کی حیثیت حاصل رہے گی۔ خلیجی ممالک ابھی کچھ مدت تک چین کو بڑے پیمانے پر تیل فراہم کرتے رہیں گے۔ دنیا بھر میں توانائی کے قابلِ تجدید ذرائع میں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ گاڑیوں کے معاملے میں بھی دنیا بہت تیزی سے ’’برق کاری‘‘ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ چینی قیادت بھی گرین ٹیکنالوجی کی طرف جارہی ہے اور وہ چاہے گی کہ خلیجی مجلسِ تعاون کے ارکان کو بھی اِس حوالے سے اپنے ساتھ رکھے۔ یہ ممالک بھی چاہیں گے کہ گرین ٹیکنالوجی کو اپنانے میں چین کے ساتھ ساتھ رہیں اور اپنی معیشت کو متنوع بنانے کے لیے چین سے مدد لیں۔

چین اپنی کیپٹل مارکیٹ میں مزید سرمایہ کاری چاہتا ہے اس لیے اس بات قوی امکان ہے کہ خلیجی ریاستیں چین میں غیر معمولی سرمایہ کاری کریں گی۔ دوسری طرف چین کی متعدد کمپنیاں خلیج کے خطے میں کان کنی اور تعمیرات کے منصوبوں کی فنڈنگ کر رہی ہیں۔ چین بازارِ زر، ٹیکنالوجی، تعمیرات اور صنعتی نقل و حمل کے شعبوں میں خلیجی ریاستوں کو مضبوط بنانا چاہتا ہے اور ڈرونز، زراعت اور روبوٹکس میں اُن کی امنگوں کی تکمیل میں معاونت کا بھی خواہاں ہے۔ ایران جنگ سے یہ بات کُھل کر سامنے آگئی کہ چین اِس خطے سے معاشی طور پر تو بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے مگر سلامتی یقینی بنانے کے حوالے سے کوئی کردار ادا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ایسے میں خلیجی ریاستوں کے پاس صرف امریکا ہی کا آپشن بچتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف تو امریکا اِس خطے کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر دوسری طرف وہی ہے جو اِس خطے کو عدم استحکام سے دوچار بھی رکھتا ہے۔ چین چونکہ خلیج کے خطے کی سلامتی کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اِس لیے اب اِس خطے کی ریاستوں کو خود ہی طے کرنا ہوگا کہ اُنہیں اپنا تحفظ اور سلامتی یقینی بنانے کے لیے کیا کرنا ہے۔

سعودی عرب اور عمان اپنی سلامتی کے لیے امریکا پر بہت زیادہ انحصار کے ہاتھوں پریشان ہیں۔ وہ اِس حوالے سے نئی حکمتِ عملی ترتیب دے رہے ہیں۔ جون میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے عمان پر بمباری کی دھمکی تھی۔ اِس کے بعد عمان کی حکومت نے علاقائی ریاستوں پر زور دیا کہ وہ واشنگٹن پر انحصار کے معاملے میں اعتدال کی راہ پر گامزن ہوں اور اِس کی ایک معقول صورت یہ ہے کہ علاقائی سطح پر دفاعی اشتراکِ عمل یقینی بنایا جائے۔ ۱۳ جون کو فرانسیسی اخبار لی مونڈے میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں عمان کے وزیرِ خارجہ سید بدرالبُسید ی نے امریکا کے بعد کے ایک دفاعی نظام کی تشکیل پر زور دیا جس میں خلیجی ریاستوں کے علاوہ ایران اور عراق بھی شامل ہو۔ بحرین، کویت اور متحدہ عرب امارات البتہ اب بھی امریکا کی طرف زیادہ کھنچ رہے ہیں۔ اِن ملکوں کے پاس اپنے دفاع کا معقول بندوبست نہیں اور ایران بھی اِن ممالک میں قائم امریکی فوجی تنصیبات پر حملے تیز کر رہا ہے اِس لیے اِن کے پاس اپنی سلامتی یقینی بنانے کے لیے امریکا سے مزید قریب ہونے کے سوا کوئی آپشن نہیں۔ خیر، جو ممالک اپنی سلامتی کے لیے امریکا کی طرف جھک رہے ہیں وہ بھی اپنی دفاعی صلاحیت میں اضافے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ ایران سے بات چیت پر بھی متوجہ ہیں تاکہ کشیدگی کا گراف گرے اور خطے میں امن و سکون کی راہ ہموار ہو۔ اس سلسلے میں وہ ترکی اور پاکستان کی طرف دیکھ رہے ہیں تاکہ اضافی سیکیورٹی پارٹنرشپس قائم کی جاسکیں۔ چین کی طرف دیکھنے کا موقع تو یہ ہے نہیں اِس لیے خلیجی ممالک امریکا کی چھتری تلے بھی محفوظ نہ رہ پانے کی صورت میں دیگر بہت سے آپشنز پر بھی غور کر رہے ہیں۔

خلیجی ریاستیں چونکہ اپنے دفاع کے لیے بہت سے آپشنز پر غور کر رہی ہیں اِس لیے اب چین بھی اِس طرف زیادہ متوجہ نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ علاقائی سلامتی کی ذمہ داری قبول کرنے میں اِس کی دلچسپی نمایاں طور گھٹ چکی ہے۔ چینی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ سلامتی کو زیادہ داؤ پر لگائے بغیر معاشی تعلقات بہتر حالت میں رکھے جائیں۔ چین اور خلیجی ممالک کے تعلقات اب بہت حد تک ایران اور چین کے تعلقات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ تعلقا بڑھتی ہوئی توقعات سے کہیں بڑھ کر محض ضرورت کا نتیجہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ خلیجی ریاستیں چونکہ ایران کے مقابلے میں چین کو زیادہ پُرکشش معاشی مواقع فراہم کرتی ہیں اِس لیے ایران جنگ مکمل ختم ہونے کی صورت میں وہ چین سے معاشی تعلقات مزید بہتر بنانے کی پوزیشن میں ہوں گی اور چین بھی ایران کے مقابلے میں اُنہیں زیادہ رعایتیں دے سکے گا۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"The Gulf's China problem".
("Foreign Affairs". July 21, 2026)

* * *

بقیہ: جموں و کشمیر اور جزائرِ اولند

تاریخ کبھی خود کو پوری طرح یا من و عن نہیں دُہراتی مگر ہاں، وہ چند ایک مثالیں ضرور پیش کرتی ہے جن کی مدد سے ہم بہت کچھ سوچ سکتے ہیں، کر سکتے ہیں۔ جزائرِ اولند کے معاملے میں ہم یہ سبق سیکھ سکتے ہیں کہ اسٹریٹجک علاقے، متصادم قومی شناختوں اور اشتعال آمیز جذبات کے حامل تنازعات کو بھی بین الاقوامی سفارت کاری، قانونی اصولوں اور سیاسی سمجھوتے (رواداری اور سودے بازی) کے ذریعے بحسن و خوبی نپٹایا جاسکتا ہے۔

متبادل یہ ہے کہ آٹھ عشروں سے جاری بحرانوں کو جاری رہنے کا موقع دیا جائے جن کے اثرات جموں و کشمیر کے پہاڑوں سے بہت دور، جنوبی ایشیا سے بھی بہت دور تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ پاکستان، بھارت اور حقیقی کشمیری قیادت کے درمیان کوئی بھی تصفیہ غیر معمولی سیاسی جرأت، سمجھوتا کرنے پر رضامندی (رواداری) اور بین الاقوامی برادری کی حمایت و امداد کے بغیر ممکن نہیں بنایا جاسکتا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ سب کچھ نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ دنیا کے ایک انتہائی حساس خطے میں حقیقی امن اور استحکام یقینی بنانے کے لیے کیا ہی جانا چاہیے۔

(ڈاکٹر غلام نبی فائی ورلڈ فورم فار پیس اینڈ جسٹس کے چیئرمین ہیں۔ جزائرِ اولند دراصل چھوٹے بڑے ۶۵۰۰ جزائر کا مجموعہ ہے۔ جو بحیرۂ بالٹک میں خلیجِ بوتھنیا کے دہانے پر واقع ہے۔ آبادی ۳۰ ہزار تک ہے۔ ۹۰ فیصد آبادی فاسٹا آئی لینڈ پر رہتی ہے۔ ٦۰ تا ۸۰ فیصد جزائر غیر آباد ہیں۔ جزائرِ اولند کا مجموعی رقبہ ۱۵۸۰ مربع کلومیٹر ہے۔)

* * *

نوجوانوں کی نئی کاکروچ جمہوریت

اروندھتی رائے

برسوں بعد اپنے بھارتی ہونے پر اس قدر فخر ہو رہا ہے۔ دراصل، جب لگا کہ اب کوئی امید نہیں بچی، وہ آ گئے۔ برسات کے ساتھ ننھے، جوان کاکروچ۔ وہ پیدا ہوئے ایک جج اور ایک لطیفے کے ملن سے۔

اب تک ہم سب اس کہانی سے واقف ہو چکے ہیں، مگر پھر بھی ریکارڈ کے لیے اسے یہاں درج کرنا ضروری ہے۔ بھارت کے چیف جسٹس سوریہ کانت کے متکبرانہ اور اس توہین آمیز تبصرے کہ 'کچھ بے روزگار بھارتی نوجوان کاکروچ اور طفیلی ہیں' کے جواب میں امریکا کے بوسٹن میں رہنے والے طالبعلم ابھجیت دیپکے نے سوشل میڈیا پر انگریزی میں لکھا: 'کیا ہو اگر سارے کاکروچ ایک ساتھ آ جائیں؟'

لاکھوں لوگوں نے اس پر ردعمل ظاہر کیا، اور اس طرح 'کاکروچ جنتا پارٹی' وجود میں آ گئی۔

دیپکے اس کہانی کے بانسری نواز کی طرح آگے آگے چلے اور ان کے پیچھے پیچھے ہزاروں نوجوان شہری چل پڑے۔ پہلی مانگ اٹھی وزیر تعلیم دھرمیندر پردھان کے استعفیٰ کی۔ وہی وزیر، جو ایک کرپٹ وزارت کے سربراہ ہیں، جس کی نگرانی میں آئے دن الگ الگ امتحانات کے پیپر لیک ہو رہے ہیں۔

اپوزیشن جماعتوں کے مطابق، ۲۰۱۴ء سے اب تک تقریباً ۱۵۲/ بار پیپر لیک ہوئے ہیں۔ پرچہ لیک کے ان واقعات نے ان لاکھوں نوجوانوں کی زندگی برباد کر دی ہے، جنہوں نے ان امتحانات کی تیاری میں کئی کئی سال صرف کیے۔ ان میں سے بعض کے والدین کو اپنے بچوں کی پڑھائی اور امتحان میں بیٹھنے کی فیس، جو ایک طرح کی قانونی وصولی ہے، بھرنے کے لیے اپنی زمین یا گھر تک فروخت کرنا پڑا۔ اسی سال مئی میں میڈیکل کورس میں داخلے کے لیے ہونے والے نیشنل ایلیجیبلٹی کم انٹرنس ٹیسٹ (نیٹ) کا پیپر لیک ہونے کے بعد مایوسی کے عالم میں کم از کم ۱۲/ طلبہ کی خودکشی کی خبریں سامنے آئی ہیں۔

جب 'کاکروچوں' کا غصہ ایک آن لائن سونامی میں تبدیل ہو رہا تھا، تبھی دیپکے نے وطن واپسی کا فیصلہ کیا۔ ٦ جون کو دہلی ایئرپورٹ سے وہ سیدھے جنتر منتر پہنچے۔ معروف سماجی کارکن سونم وانگچک بھی ان کی حمایت میں آگے آئے اور غیر معینہ مدت کی بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے۔

اسی کے ساتھ آل انڈیا اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (آئیسا) کے چھ طلبہ۔۔ نہا بورا، منیش کمار، آمین امیتوش، دانش علی، رشی کیش اور دیپک۔۔ نے بھی بھوک ہڑتال کا اعلان کیا اور سونم وانگچک کے پاس ہی ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اس دوران ملک کے دوسرے شہروں میں بھی احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے۔ جیسے جیسے بھوک ہڑتال پر بیٹھے لوگوں کی حالت تشویشناک ہوتی گئی، انٹرنیٹ پر سرگرم نوجوان سچ مچ جنتر منتر پہنچنے لگے۔

اسی دوران کاکروچ جنتا پارٹی نے اعلان کیا کہ وہ ۲۰ جولائی کو، یعنی پارلیمنٹ کے مانسون اجلاس کے آغاز سے ٹھیک ایک دن پہلے، پارلیمنٹ کی جانب مارچ کرے گی۔ لیکن اس مارچ سے دو دن قبل، ۱۸/ جولائی کی صبح دہلی پولیس نے سونم وانگچک کو اسٹیج سے زبردستی اٹھا لیا۔ پہلے انہیں ایک سرکاری اسپتال اور بعد میں ان کی اہلیہ کی درخواست پر این سی آر کے ایک نجی اسپتال میں حراست میں رکھا گیا۔ ان کی بھوک ہڑتال ۲۳ جولائی کی دیر رات ختم ہوئی۔ اس سے قبل ۲۰ جولائی کو مارچ سے پہلے آئیسا کے طلبہ نے بھی اپنی بھوک ہڑتال ختم کر دی۔

اس کے بعد پورے شہر میں 'کاکروچ' چھا گئے۔ وہ ٹرین، بس، فلائٹ اور میٹرو ہر ممکن ذرائع سے آ رہے تھے، اور ہر گھنٹے ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ دہلی کے آسمان کو سورج کی پہلی کرن نے ابھی چھوا بھی نہیں تھا کہ جنتر منتر پر صرف وہی تھے، ہزاروں ہزار۔

سورج نکلتے نکلتے یہ صاف ہو گیا تھا کہ مایوسی اور غصے سے ابل رہی یہ نسل، جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا مستقبل کا شیرازہ بکھرتے دیکھا ہے، اب وہ سب کچھ واپس لینے جا رہی تھی جو ان کے والدین اور دادا دادی کی نسلوں نے گنوایا تھا، ایک معاشرے اور ایک ملک کے طور پر ہمارے وقار، اور ایک جمہوری ملک کے شہری ہونے کے ناطے ہمارے حقوق۔

مظاہرین نے اپنی غیر معمولی ہمت اور شائستگی سے اس زہریلے خوف کو دور کر دیا، جو اتنے برسوں میں ہم سب کی عادت کا حصہ بن چکا تھا۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے یہ سب گویا مذاق ہی مذاق میں کر دکھایا۔ دن ڈھلتے ڈھلتے یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ اب یہ تحریک ان سب باتوں سے کہیں بڑی ہو چکی تھی، جن کی مانگ احتجاج کی قیادت کرنے والے رہنما کر رہے تھے۔ دھرمیندر پردھان کا استعفیٰ اب ایک چھوٹی بات ہے؛ اب بہت کچھ داؤ پر ہے۔ تمام سرکاری مشینری میں اوپر سے نیچے تک پھیلا تعفن صاف نظر آ رہا ہے، اور اس سے کسی سڑتی ہوئی لاش جیسی بدبو آ رہی ہے۔ یہاں آئے ہوئے چند بے حد چھوٹے 'کاکروچ'، جن کی عمر محض سات یا آٹھ برس ہوگی، انہیں بھی اب یہ بات بخوبی سمجھ میں آنے لگی ہے۔

اس مارچ سے ذرا پہلے ہی شہر کے پولیس سربراہ کو تیزی سے اور تقریباً خاموشی کے ساتھ بدل دیا گیا تھا، اور ہمارے خوفناک مرکزی وزیر داخلہ کی خطرناک صلاحیتوں کے بارے میں بھی لوگوں کے دلوں میں دبی ہوئی تشویش موجود تھی۔ اس کے باوجود نہ پولیس اور نہ ہی وزارت داخلہ ۲۰ جولائی کو دہلی پہنچنے والے عوامی سیلاب کے حقیقی پیمانے کا اندازہ لگا سکی۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی۔۔ بسیں، سڑکیں اور میٹرو اسٹیشن بند کر دیے۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ انہوں نے انٹرنیٹ بند کرنے کی بھی کوشش کی، لیکن انٹرنیٹ ہی کے ماحول میں پروان چڑھی نوجوان نسل نے میم اور ویڈیو کی ایسی بھرمار کر دی کہ یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ ایسے میم اور ویڈیو جو بیک وقت آپ کو ہنساتے بھی ہیں اور رلاتے بھی۔

دہلی کی سکیورٹی صورتحال کسی سے پوشیدہ نہیں، مگر اس احتجاج میں شریک نوجوان خواتین کہہ رہی ہیں کہ انہوں نے ہجوم کے اندر بھی خود کو محفوظ محسوس کیا، اگرچہ کچھ نے پولیس کی جانب سے غلط طریقے سے چھونے کی بات بھی کہی۔ ہم نے مسلمانوں، ہندوؤں، عیسائیوں، سکھوں اور بدھ مت کے ماننے والوں کے ساتھ ساتھ ہر ذات اور ہر طبقے کے لوگوں کو ایک ساتھ، ایک دوسرے کی مدد کرتے اور پولیس کے سامنے ایک دوسرے کو بچاتے ہوئے دیکھا۔ وعظ یا لمبی تقریر کرنے کے بجائے انہوں نے ہمیں اپنے خوابوں کے خوبصورت بھارت کی ایک جھلک دکھائی، بلکہ اسے حقیقت کا روپ دے کر بھی دکھایا۔

اس خطرے سے نمٹنے کے لیے پولیس نے اپنے پیلے بیریکیڈز کو ویلڈنگ کے ذریعے آپس میں جوڑ دیا، اور اپنا وہی پرانا آزمودہ حربہ اختیار کیا: پتھروں سے بھرا ٹرک احتجاجی مقام کے قریب لا کر کھڑا کر دیا گیا، پہلے سے ٹوٹی پھوٹی گاڑیاں وہاں لائی گئیں، اس امید پر کہ بعد میں یہ تاثر دیا جا سکے کہ نوجوان تشدد پر آمادہ ہو گئے تھے اور پولیس نے جو کارروائی کی،

وہ محض اپنے دفاع میں کی۔ وہ سادہ لباس میں ملبوس غنڈوں کی ایک فوج بھی ساتھ لائے، جن کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ڈنڈے تھے۔ کارروائی کی تیاری کے طور پر ریپڈ ایکشن فورس (آر اے ایف) کے اہلکاروں نے اپنی وردیوں سے اپنے ناموں کی پٹیاں بھی ہٹا دیں۔ وفادار گودی ٹی وی چینل جھوٹ پھیلانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ (کچھ تو اتنے ’ترکال درشی‘ تھے کہ انہوں نے ان واقعات کی بھی خبریں بنا دیں جو سرے سے پیش ہی نہیں آئے تھے۔ بھارت میں خبریں گویا مستقبل کے بارے میں ہوتی ہیں، حال کے بارے میں نہیں۔) مگر ان میں سے کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔

پولیس اور آر اے ایف نے لاٹھیاں برسائیں، کئی بچوں کے سر پھوڑ دیے اور کئی کے ہاتھ پاؤں۔ آنسو گیس کے گولے بھی داغے گئے، مگر نوجوان آگے بڑھتے رہے، سیدھے پارلیمنٹ کی طرف، وہیں جہاں جانے کا انہوں نے اعلان کیا تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہے تھے، سکیورٹی اہلکار اپنی اپنی جگہ سنبھال رہے تھے، اور ان کے اے کے ۴۷ کے نشانے پر نہتے طلبہ تھے۔ اس کے باوجود یہ ’کاکروچ‘ چلتے جا رہے تھے۔ اور اسی پیش قدمی کے دوران انہوں نے وہ پردہ ہٹا دیا، جس کے پیچھے یہ حکومت اپنی سفاکی کو چھپائے رکھتی ہے؛ ایک ایسی اقتدار پرست قوت جو سخت گیر اور ظالم ہے، ایک فاشسٹ حکومت۔ ایسے بے رحم اور سنگدل لوگوں کا گروہ، جو جس ملک پر حکومت کر رہے ہیں، اس کی تاریخ اور اس کے تنوع کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ جو صرف نفرت کرنا جانتے ہیں؛ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ محبت کیا ہوتی ہے، اور نہ ہی یہ پتا ہے کہ سوچنا کیا ہوتا ہے۔

جب یہ مظاہرین پارلیمنٹ کی جانب بڑھ رہے تھے، تو ہمارے بہادر، شیخی خور وزیر اعظم کو وہاں سے نکال لیا گیا۔ اراکین پارلیمنٹ کو پارلیمنٹ کی اُس نئی، چمچماتی عمارت سے باہر نکلنے سے روک دیا گیا، جس کا ارادہ ہی ہر نئے انداز میں آئین کی بنیادوں کو کمزور کرنا محسوس ہوتا ہے۔

شام تک پولیس نے احتجاجی مقام کا مرکزی اسٹیج توڑ ڈالا۔ تاہم رات ہوتے ہوتے پاش کی گھاس کی مانند یہ ’کاکروچ‘ دوبارہ وہاں اُگ آئے۔ جب پولیس اپنا کام نمٹا کر اُس رات واپس جا رہی تھی تو انہی کاکروچوں نے بچوں کو پیٹنے پر پولیس کے لیے ’اسٹینڈنگ اوویشن‘ دیا۔ مودی جی واہ!

اس سے کسی بڑے سیاسی انقلاب یا تبدیلی کی توقع کرنا نادانی ہوگی، لیکن اسے محض ایک وقتی جوش یا جذباتی ردعمل سمجھ کر مسترد کر دینا بھی حماقت ہوگی۔ اس بات پر بھی حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ نیوز چینل اور میڈیا میں غیر ملکی فنڈنگ، سی آئی اے یا بیرونی سازشوں سے متعلق قیاس آرائیاں اور سازشی نظریات کی باتیں چل رہی ہیں۔ خود پر ناز کرنے والے ایک پرانے آندولن جیوی کی طور پر میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس تحریک کے آغاز میں میں محتاط اور چوکس تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں ہم ایک اور انا تحریک کی طرف تو نہیں بڑھ رہے یعنی ۲۰۱۱ء کی وہ نام نہاد انسداد بدعنوانی عوامی تحریک، جس کی ابتدائی نیت خواہ کچھ بھی رہی ہو، لیکن آخرکار اس نے ہمیں ایک ایسی سیاسی جماعت کی حکومت دی جس نے ملک کے ہر ادارے کو تباہ کر دیا؛ ایسی جماعت جو اپنے آپ اور حکومت ہند میں کوئی فرق نہیں کرتی؛ ایسی جماعت جو نہ ملک کی عزت کرتی ہے اور نہ ہی اس کے شہریوں کی؛ ایسی جماعت جس نے نہ صرف عالمی سطح پر بھارت کو شرمندہ کیا ہے، بلکہ اسے زوال کی گہرائیوں میں بھی دھکیل دیا ہے۔

لیکن کاکروچ جنتا پارٹی کے بارے میں میرے شکوک و شبہات اس وقت دور ہو گئے جب میں نے مرکزی دھارے کے میڈیا میں اس کے خلاف تلخی اور متعصّبانہ رویہ دیکھا۔ میرے لیے یہ اعتماد کی علامت تھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ابھیجیت دیپکے کا تعلق دلت برادری سے ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ کسی کی توجہ اس پہلو پر مرکوز ہی نہیں تھی۔ پھر میرے لیے سب کچھ اُس وقت بدل گیا جب میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا، ’اگر میں خالد ہوتا یا مسلمان ہوتا تو میں جیل میں ہوتا۔‘

ان میں بھارت کے اس کریہہ سچ کو بیان کرنے کی ہمت تھی، یہ تسلیم کرنے کی جرأت کہ ہمارے ملک میں ہر چیز (یہاں تک کہ قانون بھی) سب کے لیے یکساں نہیں ہے۔ ہر چیز مکمل طور پر آپ کے مذہب، ذات، طبقے، نسل اور جنس پر منحصر ہے۔ یہ ایک بے حد گہری بات تھی، جسے انہوں نے انتہائی سادگی سے بیان کر دیا۔ ایسے وقت میں جب اپوزیشن جماعتوں کے رہنما بھی ’ہندو ردعمل‘ کے خوف سے ’مسلمان‘ کہنے کے بجائے ’اقلیتی برادری‘ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، دیپکے کی اس بات نے مجھے فوراً جنتر منتر جانے پر مجبور کر دیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب دیپکے نے ’خالد‘ کہا تو ان کا اشارہ جے این یو کے اسکالر عمر خالد کی طرف تھا، جو شرجیل امام اور کئی دوسروں کی طرح تقریباً چھ برس سے بغیر شنوائی کے جیل میں ہیں۔

اب پوچھیے عمر کا جرم کیا ہے؟ سال ۲۰۲۰ء میں شہریت ترمیمی قانون (سی اے اے) کے خلاف ہونے والے احتجاج کے دوران مظاہرین سے امن برقرار رکھنے کی اپیل کرنا، وہ بھی ایسے وقت میں جب دہلی آگ زنی، قتل اور مساجد کو نذر آتش کیے جانے کے ہولناک واقعات سے لرز رہی تھی۔ ان واقعات کو ہندو بلوائیوں نے پولیس کی نگرانی میں انجام دیا تھا۔ وہی پولیس جو کبھی ان واقعات کی خاموش تماشائی بنی رہی اور کبھی خود بھی ان میں شریک نظر آئی۔ عمر کی ضمانت کی ایک کے بعد ایک درخواست ان ججوں نے مسترد کر دی جن میں شاید اب درست فیصلہ کرنے یا حق کو پہچاننے کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔

جوں جوں کاکروچ آگے بڑھ رہے تھے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا، میں سوچنے لگی؛ شکر ہے کہ ان میں سے زیادہ تر مسلمان، سکھ، عیسائی یا آدی واسی نہیں ہیں، ورنہ انہیں کچل دیا جاتا، مار دیا جاتا، گولیاں ماردی جاتیں یا جیلوں میں ڈال دیا جاتا۔ شکر ہے کہ وہ کشمیری نہیں ہیں، ورنہ ان کی بینائی بھی چھین لی جاتی (اگرچہ ۲۰ جولائی کے احتجاج کے بعد کچھ افراد کو پیلٹ گن جیسے ہتھیاروں سے لگنے والی چوٹ جیسی چوٹیں ضرور آئی ہیں)۔ شکر ہے کہ ان میں سے زیادہ تر ہندو ہیں۔ بھارت کے لیے اس سے زیادہ افسوسناک حقیقت اور کیا ہوگی کہ آج یہ بات باعث اطمینان سمجھی جا رہی ہے۔ تاہم حالات ایک لمحے میں بدل سکتے ہیں۔ ایسی خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ دیگر ریاستوں سے ہزاروں نیم فوجی اہلکار بلائے جا رہے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ آنے والا وقت کیا منظر دکھائے گا۔

تو پھر ان سب کا حاصل کیا ہے؟ انا تحریک، جسے کارپوریٹ میڈیا میں تبدیل ہو چکے سیکڑوں ٹی وی چینلوں نے ہفتوں تک مسلسل چوبیس گھنٹے غیر معمولی کوریج دی تھی، کے برعکس کاکروچ جنتا پارٹی کے پاس اپنے علاوہ صرف انٹرنیٹ کا ہی سہارا ہے۔ انا تحریک میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) نے دراندازی کر کے اس پر قبضہ کر لیا تھا اور نریندر مودی کی قیادت والی بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) ٹی وی چینلوں کے بنائے ہوئے اس ماحول سے انتخابی فائدہ اٹھانے کے لیے پوری طرح تیار کھڑی تھی۔ اس کے برعکس کاکروچوں کے معاملے میں کوئی منظّم اپوزیشن جماعت اس انتظار میں نہیں بیٹھی کہ وہ اس تحریک کو اپنے سیاسی مفاد کے لیے اسی حد تک آگے لے جائے۔

اگر کوئی حقیقی سیاسی عمل شروع نہیں ہوتا، تو آج جو اچانک غصہ اور اشتعال نظر آ رہا ہے، وہ بتدریج ختم ہو جائے گا۔ جب تک بڑے رہنما اور اپوزیشن جماعتیں اپنی باہمی

سیاسی کشمکش اور چھوٹے موٹے اختلافات کو ایک طرف رکھ کر اتحاد کا مظاہرہ نہیں کرتیں، صورتحال تبدیل نہیں ہوگی۔ حکومت بھی یہ جانتی ہے کہ ایسا ہونے کے امکانات کم ہیں۔ اسی لیے وہ مطمئن ہے، کیونکہ اسے یقین ہے کہ اسے صرف انتظار کرنا ہے۔ اقتدار کے پاس انتظار کرنے کی طاقت ہوتی ہے، عوام کے پاس نہیں۔

یہ بھی غور طلب ہے کہ کاکروچوں کی یہ بغاوت اس وقت بھارت بھر میں جاری متعدد احتجاجی تحریکوں میں سے صرف ایک ہے۔ مدھیہ پردیش میں قبائلی برادریاں کین۔۔ بیتوا ندی جوڑ منصوبے کے خلاف احتجاج کر رہی ہیں۔ اتراکھنڈ میں گاؤں والے بڑے پیمانے پر درختوں کی کٹائی کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ گریٹ نکوبار جزائر کے ماحول کو نقصان پہنچانے کے خلاف بھی مزاحمت جاری ہے۔ منی پور گزشتہ تین برسوں سے تشدد کی آگ میں جل رہا ہے۔ روزگار نہیں ہے، مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے۔ عوامی غصہ بڑھتا جا رہا ہے، اور بی جے پی۔ آر ایس ایس کے ’بھگوان‘ کے نام والا کھیل وہی دھوکہ ثابت ہو رہا ہے، جو اصل میں تھا۔ گینگسٹروں کے ذریعے چلایا جا رہا منافع کمانے کا دھندہ۔

ایودھیا میں رام مندر کے نام پر ہوئی لوٹ کسی خراب بالی ووڈ اسکرپٹ کی طرح ہے، جس کی حقیقت اب عوام کے سامنے آ چکی ہے: شاطر مذہبی پیشوا اور بدعنوان سیاستداں مل کر غریب اور سادہ لوح عوام کے مذہبی عقیدے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ ہوٹل بنا رہے ہیں، رئیل اسٹیٹ اور مختلف قسم کی جائیدادیں جمع کر رہے ہیں، اور بڑی بڑی لگژری گاڑیوں میں گھوم رہے ہیں۔ اس بدعنوانی اور دن دہاڑے ہونے والی لوٹ کے روابط صرف نچلی سطح تک محدود نہیں بلکہ اس کی ڈور اقتدار کے اعلیٰ ترین حلقوں تک جاتی ہے۔

کیا یہ کاکروچ مل کر ہمیں اس گہرائی سے نکال سکتے ہیں؟ یہ آسان نہیں ہوگا۔ بھارت میں اب تک ہونے والی عوامی تحریکوں کے نتائج زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہے ہیں۔ اگر انہیں ٹوٹے ہوئے خوابوں اور ادھوری امنگوں کی مختصر تاریخ کہا جائے تو شاید زیادہ درست ہوگا۔

ساٹھ اور ستر کی دہائی میں کئی تحریکوں، جن میں نکسل تحریک کی مسلح بغاوت بھی شامل تھی، نے دولت کی منصفانہ تقسیم اور کسانوں کو کھیتی کی زمین کی ملکیت دینے کا مطالبہ کیا تھا، مگر انہیں کچل دیا گیا۔ اسی طرح اسی اور نوے کی دہائی میں سماجی تحریکوں، جن میں سب سے قابل ذکر ’نرمدا بچاؤ آندولن‘ ہے، اور بعد میں آندھرا پردیش، چھتیس گڑھ اور جھارکھنڈ میں ماؤنواز تحریک نے کسانوں اور قبائلی برادریوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کیے جانے کے خلاف جدوجہد کی۔ ان کا مطالبہ صرف اتنا تھا کہ غریبوں کے پاس جو کچھ باقی ہے، وہ ان سے نہ چھینا جائے، مگر انہیں بھی کچل دیا گیا۔

۲۰۰۰ء کی دہائی تک آتے آتے امیدیں صرف ’قومی دیہی روزگار گارنٹی ایکٹ‘ (منریگا) تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ اس قانون کے تحت کم از کم ایک مقررہ اجرت پر تقریباً تین ماہ کے روزگار کا حق دیا گیا تھا، اگرچہ یہ اجرت شاید کسی بڑے شہر کے مہنگے ریستوران میں ایک وقت کے کھانے کے برابر ہی بنتی ہو۔ لیکن موجودہ حکومت نے اب اسے بھی تقریباً غیر مؤثر بنا دیا ہے اور اس کی جگہ صرف گزارے کے لیے راشن فراہم کیا جا رہا ہے، جو وزیر اعظم مودی کی تصویر والے تھیلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ تھیلے لوگوں کو اس انداز میں دیے جاتے ہیں جیسے چلتی گاڑی سے کسی بھکاری کی طرف خیرات پھینکی جا رہی ہو، تاکہ بدلے میں ان کا ووٹ حاصل کیا جا سکے اور وہ خود کو اس احسان کا مقروض سمجھیں۔ تاہم ملک کی ڈگمگاتی معیشت کو دیکھتے ہوئے اس نظام کا مستقبل بھی خطرے میں ہے۔

اب سال ۲۰۲۶ء ہے اور حالات یہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ شہریوں کو حق رائے دہی اور اپنی شہریت کے تحفظ کے لیے بھی جدوجہد کرنا پڑ رہی ہے۔ شہریت ترمیمی قانون (سی اے اے) اور این آر سی کا میل نازی جرمنی کے ۱۹۳۵ء کے نیورمبرگ قوانین کا ایک ’ہندو راشٹر‘ والا ورژن ہے۔ ہٹلر کے دور میں انہی قوانین کے تحت جرمن شہریوں کی شہریت کا فیصلہ ان کے ’لیگیسی پیپرز‘ (خاندانی یا موروثی دستاویز) کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ (آج کی تاریخ میں تلاش کیا جائے تو بھارت کی کتنی آبادی کے پاس ایسے دستاویز ہوں گے؟)

سی اے اے اور این آر سی کے خلاف تحریک اس وقت سست پڑ گئی، جب بڑے پیمانے پر احتجاج کے دوران متعدد مظاہرین کی جان چلی گئی اور کارکنوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ تاہم ان کا ایک اثر ضرور ہوا کہ حکومت کو ان نئے قوانین کے نفاذ کی رفتار دھیمی کرنی پڑی۔

لیکن اب یہی سی اے اے۔ این آر سی، جس کے بارے میں بہت سے لوگوں نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا کہ اس کا بنیادی مقصد ملک کے مسلمانوں کو نشانہ بنانا تھا، ووٹر لسٹ کی اسپیشل انٹینسیو ریویژن (ایس آئی آر) کی صورت میں دوبارہ واپس آ گیا ہے۔ کوئی بھی افسر آ کر یوں ہی بتا دیتا ہے کہ ہمارا پاسپورٹ بھی شہریت کا ثبوت نہیں ہے۔ لاکھوں لوگوں کے نام ووٹر لسٹوں سے خارج کیے جا رہے ہیں۔ پورا ملک گھبراہٹ کے عالم میں اپنے ’لیگیسی پیپرز‘ تلاش کر رہا ہے۔ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ ہم کیا ہیں۔۔ ہم قانونی شہری ہیں یا غیر قانونی؟ کیا ہمارے پاس کوئی حقوق ہیں؟ ہم میں سے کون ان بڑے بڑے ڈیٹینشن سینٹر میں لے جایا جائے گا جو حکومتیں ’مشکوک شہریوں‘ کے لیے بنا رہی ہیں؟ کیا ہم ایک ٹریبونل سے دوسرے ٹریبونل تک دوڑتے ہوئے اپنی زندگی گزار دیں گے؟ فسطائی قوتوں کو ایسی افراتفری اور کنفیوژن بہت محبوب ہے۔

شاید ہماری اسی گھبراہٹ اور بے چینی کی وجہ سے ہم کاکروچوں کی تحریک سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اس کا موازنہ بنگلا دیش، نیپال اور سری لنکا میں اقتدار کا تختہ الٹ دینے والی نوجوانوں کی بغاوتوں سے کیا ہے، مگر بھارت اتنا بڑا ملک ہے کہ یہاں ایسا ہو پانا مشکل ہے۔ وہیں، کچھ لوگ اس کا موازنہ جے پرکاش نارائن کی اس تحریک سے کرتے ہیں جس نے ۱۹۷۷ء میں اندرا گاندھی کی حکومت کو اقتدار سے ہٹا دیا تھا۔ میرے خیال میں یہ دونوں موازنہ درست نہیں ہیں۔ کاکروچ جنتا پارٹی ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی اپنی ایک الگ اور منفرد شناخت ہے، جو اپنے ہی دور کے حالات سے پیدا ہوئی ہے۔ یہاں عام گھروں سے تعلق رکھنے والے نوجوان ایک ایسی بے رحم اور انتقام لینے والی حکومت کے سامنے کھڑے ہیں، جو اپنے مخالفین کے ساتھ ذرہ برابر نرمی نہیں برتتی۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ انتقامی کارروائیوں کی منصوبہ بندی ہو رہی ہوگی، اور آج نہیں تو کل، جنہیں بھی وہ اس تحریک کا محرک سمجھتے ہیں، انہیں کسی نہ کسی شکل میں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

سوچنے والی بات یہ بھی ہے کہ ایک ایسی حکومت، جو واضح طور پر غیر مقبول ہوتی جا رہی ہے، اسے اقتدار میں لانے والوں ہی پر حملہ کرنے کا اعتماد آخر کہاں سے آتا ہے؟ شاید اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ انتخابی کھیل اب اس کی مٹھی میں ہے۔ انتخابی مشینری پر اس کا قبضہ ہے۔ الیکشن کمیشن کی تشکیل ہی میں خامی ہے، اور اب اس کے غیر جانبدار ہونے پر ذرہ برابر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ الیکٹرانک ووٹنگ مشینوں (ای وی ایم) میں مبینہ طور پر چھیڑ چھاڑ کی گئی، ووٹر لسٹوں سے لاکھوں شہریوں کے نام حذف کر دیے گئے، لاکھوں جعلی نام بھی شامل کیے گئے، انتخابات کرانے والے افسران پوری طرح اس عمل میں شریک نظر آتے ہیں، عدالتوں سے توقع کی

جاسکتی ہے کہ وہ ایسی سنگین بے ضابطگیوں پر یا تو تاخیر کریں گی یا پھر آنکھیں بند کرلیں گی، پولیس تو گویا غیر جانبداری کا مطلب ہی بھول چکی ہے، اور ذرائع ابلاغ اس حد تک اقتدار کے آگے جھکنے کو تیار ہیں کہ ایک اشارے پر رینگنے لگیں۔ انتخابی حلقوں کی حد بندیاں اس انداز سے تبدیل کی جارہی ہیں کہ اس کا فائدہ صرف بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کو پہنچے۔ ایسے میں برسر اقتدار جماعت کو آخر کس بات کا ڈر ہے؟ وہ کسی کی بات کیوں سنے؟ وہ دنیا کی سب سے امیر سیاسی جماعت ہے، جسے دنیا کے چند امیر ترین صنعتکاروں کی حمایت حاصل ہے۔ وہ ہر چیز خرید سکتی ہے، ہر شخص کو خرید سکتی ہے؛ یا یوں کہیے کہ کم از کم اسے تو یہی لگتا ہے۔

لیکن کیا یہ کھیل ہمیشہ چلتا رہے گا؟ کیا ہر وقت تمام لوگوں کو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے؟ کیا کروڑوں کی آبادی والے اس ملک کے لوگ ہمیشہ بے مردہ بنے رہیں گے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کاکروچ نکل پڑے ہیں۔ اسی ہفتے بھارت۔ امریکا تجارتی معاہدے کے خلاف کسان بھی دہلی کی جانب روانہ ہوئے تھے، تاہم یقین دہانیوں کے بعد واپس لوٹ گئے ہیں۔ کسانوں کے لیے تباہ کن قرار دیے جانے والے اس معاہدے پر بھارت کی حکومت نے کسانوں کی رضامندی کے بغیر، ان کی طرف سے دستخط کیے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے ہی شہر کی سرحدیں سیل کر دی گئی تھیں۔ شاید ہم سب کو کسانوں اور کاکروچوں سے یہ سیکھنا چاہیے کہ تھوڑا سا خطرناک کیسے بنیں۔ نوجوانوں نے ہمیں تحفہ دیا ہے، اب یہ ہم پر ہے کہ ہم ان کی اس کوشش کو کس طرح بامعنی اور کامیاب بناتے ہیں۔

جب کوئی وزیراعظم سوالوں سے بچنے کے لیے ملک ہی سے باہر بھاگ جاتا ہے، تو جلد ہی اسے سیاسی طور پر بھی میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ حکومت آسانی سے نہیں جائے گی۔ یہ دارالحکومت کی سڑکوں پر اپنی بے عزتی برداشت نہیں کرے گی۔ ہوسکتا ہے کہ ہمیں خون خرابہ دیکھنے کو ملے۔ نوجوانوں کا غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جوش و جذبے سے بھرپور اس نوجوان ہجوم میں کب کوئی شخص اپنا ضبط کھو بیٹھے اور پولیس کو فائرنگ کا بہانہ مل جائے، یہ کہنا مشکل ہے۔ وہ ہمیں توڑنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے؛ ہمیں بھی انہیں روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی ہوگی۔

(بحوالہ: ’’دی وائر اردو ڈاٹ کام‘‘۔ ۲۵ جولائی ۲۰۲۶ء)

* * *

غزہ نسل کُشی: بھارت کا گِھناؤنا کردار

افتخار گیلانی

مئی ۲۰۲۴ء میں اسپین کی کارٹیجینا بندرگاہ کے گودی مزدور اس وقت ششدر رہ گئے جب انہیں معلوم ہوا کہ بھارت کے شہر چنئی سے روانہ ہونے والا ایک تجارتی مال بردار جہاز ’بورکم‘ عسکری سامان لے جارہا تھا، اور اس کی حتمی منزل غزہ سے بہ مشکل ۳۰ کلومیٹر دور واقع اسرائیل کی اشدود بندرگاہ تھی۔

یہ ایک ایسا وقت تھا جب غزہ پر اسرائیلی عسکری جارحیت اپنے عروج پر تھی، اور عوام کے شدید اور بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے بیشتر یورپی حکومتوں نے اسرائیل کو گولہ بارود کی ترسیل روک دی تھی۔ ہسپانوی مزدوروں کے احتجاج کے بعد حکومت نے بالآخر اس جہاز کو لنگر انداز ہونے اور ایندھن کی فراہمی کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔

کسٹم کے دستاویزوں سے یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ اس کھیپ میں ۲۰ ٹن راکٹ انجن، ۱۲ء۵ر ٹن بارودی مواد سے لیس راکٹ اور ۱۵۰۰ر کلوگرام مخصوص دھماکا خیز مواد شامل تھا، جسے بھارتی دفاعی کمپنیوں نے تیار کیا تھا، جن میں ’پریمیئر ایکسپلوسیوز لمیٹڈ‘ اور سرکاری ملکیت والی ’مینوشنز انڈیا لمیٹڈ‘ شامل تھیں۔

ابھی اس واقعہ کو ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ ۶ جون ۲۰۲۴ء کو وسطی غزہ کے نصیرات پناہ گزین کیمپ میں ایک اسرائیلی فضائی حملے نے اقوام متحدہ کے ایک اسکول کو نشانہ بنایا، جو عام شہریوں کے لیے پناہ گاہ کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔

جب مقامی رہائشی ملبے سے زندہ بچ جانے والوں کو تلاش کر رہے تھے، تو انہوں نے اس میزائل کے ٹکڑوں کی ویڈیو بنائی جس نے اس احاطے کو تباہ کر دیا تھا۔ ملبے کے درمیان اس میزائل کی باقیات پر ایک تحریر بالکل واضح طور پر نظر آرہی تھی، ’’میڈ ان انڈیا‘‘ یعنی بھارت میں تیار کردہ۔ اس وحشیانہ حملے میں اسکول کے اندر پناہ لینے والے کم از کم ۳۳ فلسطینی ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے۔

حال ہی میں، اسرائیلی وزیراعظم بنجمن نیتن یاہو نے امریکی نائب صدر جے ڈی وینس کے اس دعوے کے جواب میں کہ امریکا ہی اسرائیل کا واحد ناگزیر اتحادی ہے، پر یہ تبصرہ کیا کہ اسرائیل کے پاس بھارت کی شکل میں ایک طاقتور دوست موجود ہے۔ ان کا یہ تبصرہ، کچھ غلط نہیں تھا۔

حال ہی میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ۴۲ صفحات پر مشتمل ایک تحقیقاتی رپورٹ کی اشاعت کے بعد اس پر مہر لگ گئی کہ کس طرح بین الاقوامی انسانی ضابطوں کو نظرانداز کرتے ہوئے بھارت نے اسرائیل کی جنگی دفاعی سپلائی چین میں ایک کلیدی کردار ادا کیا۔

ایمنسٹی نے کسٹم کے ریکارڈ، کارپوریٹ فائلنگز، جہاز رانی کے گوشواروں اور برآمدی ریکارڈ کا باریک بینی سے جائزہ لے کر اس پورے نیٹ ورک کی کڑیاں جوڑ کر ایک ایسا ڈیٹابیس تیار کردیا ہے، جو بتاتا ہے کہ ۷ر اکتوبر ۲۰۲۳ء سے ۳۰ نومبر ۲۰۲۵ء کے درمیان بھارت سے اسلحہ کی ۲۵۹۶ کھیپیں اسرائیل روانہ کردی گئی تھیں۔

ان کھیپوں میں عسکری ہتھیار، گولہ بارود کے پرزے، بکتر بند گاڑیوں کے پرزے اور دیگر دفاعی سامان شامل تھے جو اسرائیلی مسلح افواج یا اسرائیلی دفاعی کمپنیوں کو فراہم کیے گئے۔ ایمنسٹی نے نتیجہ اخذ کیا کہ:

غزہ میں اسرائیل کی عسکری مہم کے دوران، بھارت اسرائیلی مسلح افواج سے قریبی تعلق رکھنے والی اسرائیلی کمپنیوں کے لیے عسکری پرزہ جات، گولہ بارود کے اجزا اور دفاعی سامان کا ایک اہم سپلائر بن کر ابھرا۔

غزہ جنگ شروع ہونے کے بعد جیسے ہی یورپی حکومتوں پر عسکری برآمدات معطل کرنے کے لیے داخلی سطح پر دباؤ بڑھا، بھارت کے دفاعی مینوفیکچرنگ سیکٹر نے خاموشی سے اس خلا کو پر کر دیا۔ بھارت نے نہ صرف انفرادی عسکری مصنوعات برآمد کیں، بلکہ وہ اس صنعتی نظام میں ایک انتہائی اہم درجے کا سپلائر بن گیا جس نے اسرائیل کی دفاعی پیداوار کو برقرار رکھنے میں مدد کی۔

ایمنسٹی نے بھارت سے بھیجے گئے ۳,۹۰,۵۱۶ ملٹری گریڈ کے چھوٹے ہتھیاروں کے پرزہ جات کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں خودکار ہتھیاروں، ٹرگر کے طریقہ کار، بیرل اور دیگر وہ تمام پرزے شامل ہیں جو خاص طور پر عسکری آتشیں اسلحے کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔

تحقیق کاروں نے ۵,۶۴,۹۷۰ دھماکا خیز مواد اور اس کے اجزاء کی نشاندہی کی ہے، جن میں آرٹلری شیل کے خول، ڈرون کے وار ہیڈ کے پرزے اور گولہ بارود کی تیاری کے لیے استعمال ہونے والے دیگر حصے شامل ہیں۔ رپورٹ میں نوٹ کیا گیا ہے:

جمع کیے گئے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ تحقیق مدت کے دوران بھارت سے اسرائیلی دفاعی کمپنیوں کو عسکری اجزا کی منتقلی کا ایک مسلسل اور باقاعدہ سلسلہ جاری رہا۔

اس تحقیقاتی رپورٹ میں عسکری گاڑیوں کے ۲۹۸ پرزوں کا بھی ریکارڈ موجود ہے، جو اسرائیلی مسلح افواج کے لیے سامان تیار کرنے والے اسرائیلی مینوفیکچررز کو فراہم کیے گئے تھے۔

اس رپورٹ کی سب سے نمایاں دریافت یہ ہے کہ اس سپلائی چین میں سرکاری شعبے کے ادارے اور نجی صنعت دونوں یکساں طور پر شامل تھے۔ حکومت کی ملکیت والی ڈیفنس پبلک سیکٹر انڈرٹیکنگز میں، ایمنسٹی نے 'مینوشنز انڈیا لمیٹڈ'، 'ایڈوانسڈ ویپنز اینڈ ایکوپمنٹ انڈیا لمیٹڈ'، اور 'انڈیا آپٹل لمیٹڈ' کو ایسے مینوفیکچررز کے طور پر ظاہر کیا ہے جن کی مصنوعات زیرِ مطالعہ مدت کے دوران اسرائیلی دفاعی سپلائی چین کا حصہ بن گئیں۔

یہ کمپنیاں مکمل طور پر حکومتِ کی ملکیت ہیں اور ۲۰۲۱ء میں 'آرڈیننس فیکٹری بورڈ' کی ازسرِ نو تنظیم کے بعد قائم کی گئی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ کئی نجی کمپنیاں بھی اس صف میں کھڑی ہیں، جن میں 'پریمیئر ایکسپلوسیوز لمیٹڈ'، 'کلیانی اسٹریٹجک سسٹمز'، 'انڈو۔ایم آئی ایم'، 'اشوکا مینوفیکچرنگ' اور دیگر شامل ہیں جو آرٹلری کے اجزا، دھماکا خیز مواد، باریک بینی سے تیار کردہ انجینئرنگ پروڈکٹس اور دھاتی پرزے بنانے میں مصروف ہیں۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب ایمنسٹی انٹرنیشنل کی اس تحقیق پر بھارت، پاکستان و مغرب کے زیادہ تر روایتی میڈیا نے مکمل خاموشی اختیار کرلی۔ دنیا کے بڑے اور بااثر ترین خبری اداروں نے اس پر کوئی مخصوص رپورٹ شائع نہیں کی۔

جہاں بی بی سی کی مرکزی انگریزی سروس نے اس رپورٹ کو نظرانداز کیا، ہندی سروس نے اس خبر کو بھارتی حکومت کے ردعمل کے زاویے سے پیش کیا۔ تقریباً تمام بھارتی میڈیا آؤٹ لیٹس کا رویہ بھی ایسا ہی رہا۔

انہوں نے رپورٹ کے مندرجات کو شائع کرنے کے بجائے وزارتِ خارجہ کے ترجمان کے بیان پر توجہ مرکوز کی، جس میں بتایا گیا کہ اسرائیل کو تمام اسلحے کی منتقلی قانونی اور بین الاقوامی قوانین کے مطابق تھی۔ اسی طرح زیادہ تر مرکزی بھارتی ٹیلی ویژن نیٹ ورکس اور قومی اخبارات نے بھی اس رپورٹ کو برائے نام اہمیت دی یا بالکل نظرانداز کردیا۔

یہ تغافل اور خاموشی اس لیے بھی نمایاں ہے کہ انہی مغربی اداروں نے غزہ میں اسرائیلی فوجی مہم، انسانی المیے، یرغمالیوں کے مذاکرات، جنگ بندی کی سفارت کاری اور خاص طور پر اسرائیل کو مغربی فوجی امداد کو کور کرنے کے لیے وسیع کوریج دی۔

پچھلے دو سالوں کے دوران، رائٹرز، اے پی، بی بی سی، سی این این، دی ٹائمز، اور دی پوسٹ ان تمام اداروں نے امریکی فوجی امداد، برطانوی برآمدی لائسنسوں، جرمن اسلحے کی منظوریوں اور مغربی ہتھیاروں کی منتقلی کو روکنے کے لیے عدالتوں میں دائر مختلف چیلنجز پر باریک بینی سے رپورٹنگ کی ہے۔ جس کی وجہ سے اسرائیل کو گولہ بارود کی فراہمی روکنے کے لیے یورپ میں رائے عامہ بڑی حد تک ہموار ہوگئی۔ تاہم اسی سپلائی چین میں بھارت کے مبینہ کردار سے متعلق ایمنسٹی کی اس تحقیقات پر ان اداروں نے کیوں توجہ نہیں دی، ایک معمہ ہے۔

ایمنسٹی کی اس رپورٹ میں سب سے زیادہ انکشاف کرنے والے وہ مشترکہ منصوبے ہیں جو بھارت اور اسرائیل کے درمیان بڑھتے ہوئے گہرے صنعتی تعلقات کی عکاسی کرتے ہیں۔ رپورٹ میں 'پی ایل آر سسٹمز' کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے جو 'اسرائیل ویپن انڈسٹریز' کے ساتھ ایک مشترکہ منصوبہ ہے، اور 'الفائل سیک ڈیفنس اینڈ ایرو اسپیس سسٹمز' کا جو 'البٹ سسٹمز' کے ساتھ قائم کیا گیا ہے۔

ایمنسٹی کی تحقیقات میں جن مصنوعات کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ کسی گمنام عالمی منڈی میں منتقل نہیں ہوئی تھیں۔ رپورٹ کے مطابق، ان میں سے بیشتر مصنوعات اسرائیل کی تین سب سے بڑی دفاعی کمپنیوں کو بھیجی گئیں: البٹ سسٹمز، اسرائیل ایرو اسپیس انڈسٹریز، اور رافیل ایڈوانسڈ ڈیفنس سسٹمز۔

ایمنسٹی ان فرموں کو اسرائیلی فوج کا اہم سپلائر قرار دیتی ہے اور اس کا استدلال ہے کہ اکتوبر ۲۰۲۳ء کے بعد بھی ان کمپنیوں کو سامان کی مسلسل منتقلی ہی اس کی تحقیقات کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس تمام تر صورتِ حال سے جو تصویر ابھرتی ہے، وہ ایک روایتی برآمدی منڈی کی نہیں بلکہ ایک مربوط صنعتی نیٹ ورک کی ہے۔ بھارتی کمپنیاں پرزہ جات تیار کرتی ہیں، اور اسرائیلی دفاعی فرمیں انہیں بڑے ہتھیاروں کے نظاموں میں مربوط کردیتی ہیں۔ ایمنسٹی کا موقف ہے کہ وہی ہتھیار اور نظام بالآخر اسرائیل کی عسکری کارروائیوں کا حصہ بنتے ہیں۔

دہائیوں تک بھارت کی شناخت بنیادی طور پر دنیا کے سب سے بڑے عسکری سامان کے درآمد کنندگان میں ہوتی رہی۔ اسرائیل اس کے اہم سپلائرز میں سے ایک تھا، خاص طور پر ۱۹۹۹ء کی کرگل جنگ کے بعد، جب نئی دہلی نے اسرائیلی نگرانی کے نظام، ڈرونز، میزائلوں اور درست نشانہ بنانے والے مینیشنز کی طرف بڑے پیمانے پر رجوع کیا۔

مودی حکومت کے خود کفیل بھارت اور ''میک ان انڈیا'' کے نعروں نے غیر ملکی دفاعی مینوفیکچررز کو بھارت کے اندر پیداواری سہولیات قائم کرنے کی ترغیب دی۔ اسرائیلی کمپنیاں اس پالیسی کو اپنانے والوں میں سب سے آگے تھیں، جنہوں نے ڈرون، گولہ بارود، درست انجینئرنگ مصنوعات اور میزائل کے پرزے تیار کرنے کے لیے بھارتی فرموں کے ساتھ مشترکہ منصوبے شروع کیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ، بھارت صرف ایک گاہک نہیں رہا بلکہ اسرائیل کے دفاعی پیداواری نیٹ ورک کا ایک لازمی اور غیر منفک حصہ بن گیا۔

ایمنسٹی کی رپورٹ کے مطابق اس سپلائی چین کے ایک سرے پر بھارتی مینوفیکچررز ہیں۔ ان میں سے کچھ سرکار کی ملکیت والی ڈیفنس پبلک سیکٹر انڈرٹیکنگز ہیں جو ۲۰۲۱ء میں آرڈیننس فیکٹری بورڈ کی ازسرِ نو تنظیم کے بعد قائم ہوئی تھیں اور نجی انجینئرنگ فرمیں ہیں جو باریک پرزہ جات کی اہم سپلائر بن کر ابھری ہیں۔ دوسرے سرے پر اسرائیل کی دفاعی صنعت کے تین مضبوط ستون کھڑے ہیں: البٹ سسٹمز، اسرائیل ایرو اسپیس انڈسٹریز، اور رافیل ایڈوانسڈ ڈیفنس سسٹمز۔

یہ کمپنیاں اسرائیل کے سب سے مشہور عسکری پلیٹ فارمز تیار کرتی ہیں، جن میں ڈرون، گائیڈڈ مینیشنز، میزائل سسٹمز، آرٹلری اور الیکٹرانک وارفیئر ٹیکنالوجیز شامل ہیں۔ ایمنسٹی کے مطابق، بھارتی ساختہ پرزے ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کے بعد ان تینوں کمپنیوں کی سپلائی چین میں شامل ہوئے ہیں۔

اسرائیل کے ساتھ بھارت کی اسٹریٹجک شراکت داری کے حامیوں کا استدلال ہے کہ دفاعی تعاون ایک خودمختار پالیسی کا فیصلہ ہے جو قومی سلامتی، ٹکنالوجیکل تعاون اور معاشی مواقع سے منسلک ہے۔ بھارت نے دفاعی مینوفیکچرنگ کا عالمی مرکز بننے کے لیے بھاری سرمایہ کاری کی ہے، اور برآمدات اس عزائم کا مرکزی حصہ ہیں۔

بھارتی وزارت خارجہ نے ترجمان نے بھی اس دفاعی سپلائی چین کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل کو ہتھیار بین الاقوامی قوانین اور داخلی قوانین کے تحت فراہم کئے گئے۔ یہ سچ ہے کہ ۱۹۷۱ء کی پاک ہند جنگ کے دوران، اسرائیل نے امریکا ناراضی کو درکنار کرتے ہوئے بھارت کی خفیہ طور پر انتہائی اہم مدد کی۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ بنگلا دیش کی فتح کا سہرا بھارتی فوج کے ایک یہودی جنرل جے ایف آر جیکب کے سر بندھنے والا تھا۔ ان ہی کی یونٹ سب سے پہلے ڈھاکا پہنچ گئی تھی اور انہوں نے ہی پاکستانی فوج کی ایسٹرن کمانڈ کے سربراہ جنرل نیازی کو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرایا تھا۔

مگر عین وقت پر وزیرِاعظم اندرا گاندھی نے کلکتہ میں مقیم بھارتی جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کو ڈھاکا پہنچ کر اس ہتھیار ڈالنے

کی رسم کی سرپرستی کرنے کی ہدایت کی۔ وہ شاید جانتی تھی کہ ایک یہودی جنرل کے سامنے کسی پاکستانی مسلمان جنرل کا ہتھیار ڈالنا عرب اور اسلامی ممالک میں ایشو بن سکتا ہے۔

جنرل جیکب نے آخر وقت تک کانگریس اور اندرا گاندھی کو اس کے لیے معاف نہیں کیا۔ وہ اس بات پر بھی خفا تھے کہ ان کو آرمی چیف بھی بننے نہیں دیا گیا۔ ریٹائرمنٹ کے برسوں بعد کرگل جنگ کے بعد ۱۹۹۹ء میں اٹل بہاری واجپائی حکومت نے ان کو گوا اور پھر پنجاب کا گورنر بنا دیا تھا۔ ان کی وردی، فوٹو اور میڈیلز تل ابیب کے یہودی ملٹری میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ۱۹۷۱ء میں سفارتی تعلقات نہ ہونے کے باوجود ۱۶۰ ملی میٹر اور ۱۰۵ ملی میٹر کے مارٹر، گولہ بارود اور ریڈار سسٹمز اسرائیل نے بھارت کو فراہم کیے تھے۔

یہ ہتھیار لکسمبرگ اور لیچٹنسٹائن جیسے تیسرے مقامات کے ذریعے بھارت پہنچ گئے تھے اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کے پرنسپل سیکرٹری پی این ہکسر خود اس آپریشن کی نگرانی کر رہے تھے۔ اسی طرح اسرائیل نے بنگلا دیش کی آزادی کے لیے لڑنے والی گوریلا فورس 'مکتی باہنی' کو بھی خاموشی سے مالی و عسکری امداد اور سامان فراہم کی۔

امریکا اور برطانیہ اس وقت اعلانیہ طور پر پاکستان کے ساتھ کھڑے تھے۔ اسی طرح کرگل جنگ کے وقت، جب جوہری دھماکوں کی وجہ سے بھارت پر پابندیاں عائد تھیں، اسرائیل نے گولہ بارود کی ترسیل کو یقینی بنایا۔ اس کے علاوہ اسرائیلی 'ہیرون' اور 'سرچر' نامی فضائی گاڑیاں بھی روانہ کیں، جنھوں نے زمینی فوج اور فائٹر جیٹس کو انتہائی درست معلومات فراہم کیں۔

اس پس منظر میں بھارتی دفاعی ماہرین کا کہنا ہے کہ یورپ کا دروازہ بند ہونے کے بعد جب اسرائیل نے مدد کی درخواست کی، تو کوئی بھی بھارتی حکومت اس کو مسترد نہیں کر سکتی تھی۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا غزہ کی اس جنگ میں اسرائیل کی سلامیت یا اس کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق تھا؟ وہ یہ جنگ کسی ملک کے خلاف نہیں بلکہ ایک مزاحمتی گروپ اور فلسطینی غیر مسلح عوام کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اس کو کسی ایئر فورس نہ کسی باضابطہ فوج کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ تو فلسطینی عوام کی نسل کشی پر آمادہ تھا۔

بھارتی سفارتی نکتہ نظر یہ سے بھی مدد کرنے کا استدلال درست تبھی ہو سکتا تھا، اگر کسی باضابط جنگ میں اسرائیل کے وجود کو خطرہ لاحق ہوتا۔ مگر نسل کشی پر آمادہ کسی بھی فوج کو گولہ بارود فراہم کرنے کا مطلب بس اتنا ہی ہے کہ آپ کے ہاتھ بھی بے گناہوں کے خون سے رنگ گئے ہیں۔

\\\\\\ باقی صفحہ نمبر ۱۴ //////

میدانِ جنگ یا ٹیسٹنگ گراؤنڈ؟

بھال چندر جانی

امریکا، اسرائیل، روس، چین، فرانس، جرمنی، برطانیہ اور ترکیہ اِس وقت بڑے پیمانے پر اسلحہ اور گولا بارود تیار کر رہے ہیں۔ ہائی ٹیک کو ہتھیاروں، ڈرون، میزائل اور لڑاکا طیاروں میں بروئے کار لانے کا عمل بھی تیزی سے جاری ہے۔ اِس حوالے سے دن رات تحقیق کی جا رہی ہے تاکہ جنگی ساز و سامان کو زیادہ سے زیادہ کارگر اور ''بار آور'' ثابت کیا جاسکے۔ یہ ہتھیار، گولا بارود، طیارے، میزائل، ڈرون اور دفاعی نظام بروقت آزمائش بھی چاہتے ہیں۔

''نئی ِگلی، نیا داؤ'' والی بات امریکا پر صادق آتی ہے۔ چار پانچ عشروں کی تاریخ سے اندازہ ہوتا کہ امریکا نے چند برس کے وقفے سے دنیا بھر میں جنگیں اور خانہ جنگیاں شروع کی ہیں اور اُنہیں ہوا دی ہے۔ یہ سب کچھ اِس طور چلتا رہا ہے کہ کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ امریکا اپنے اسلحہ ساز اداروں میں تیار کردہ ہتھیاروں اور جنگی ساز و سامان کی آزمائش چاہتا ہے۔ چند برس کے وقفے سے امریکا کسی نہ کسی ملک پر حملہ کرتا ہے اور چار پانچ دن تک اپنے جدید ترین ہتھیار آزماتا ہے۔ وہ دنیا کو دکھانا بھی چاہتا ہے کہ اُس کے پاس پوری قطعیت کے ساتھ نشانہ لگانے والے ہتھیار ہیں۔ جب مقصد حاصل ہو جاتا ہے تب امریکا کچھ دن سکون سے بیٹھ جاتا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ ایک زمانے سے ہتھیاروں کی آزمائش کا میدان یعنی ٹیسٹنگ گراؤنڈ بنا ہوا ہے۔ امریکا، روس، اسرائیل، فرانس، برطانیہ، ترکیہ اور جرمنی کے تیار کردہ ہتھیار مختلف لڑائیوں میں استعمال ہوتے رہے ہیں اور دنیا کو اندازہ ہوتا رہا ہے کہ وہ کیا بنا چکے ہیں، کیا بنا رہے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں چھیڑی جانے والی لڑائیوں کے نتیجے میں ہتھیاروں کی تاثیر کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کی مہارت بھی کھل کر سامنے آتی ہے۔

غزہ، شام، لبنان، یمن اور بحیرۂ احمر کے بعض حصوں میں کئی سال سے چھوٹے اور بڑے پیمانے کی لڑائیاں جاری ہیں۔ امریکا، روس، اسرائیل، ترکیہ اور ایران سمیت متعدد ممالک کے بنائے ہوئے ہتھیار اِن لڑائیوں میں کھل کر آزمائے جاتے رہے ہیں۔ حال ہی میں امریکا نے اسرائیل کے ساتھ مل کر ایران پر حملہ کیا۔ یہ لڑائی کئی ماہ چلی اور اب بھی کبھی کبھی تھوڑا بہت ''شغل میلہ'' ہو ہی جاتا ہے۔ امریکا اور اسرائیل کے علاوہ ایران نے بھی اِس لڑائی میں اپنے جدید ترین میزائل اور دیگر جنگی ساز و سامان کو خوب آزمایا ہے۔ باضابطہ افواج کے علاوہ حزب اللہ، حوثی ملیشیا، حیات التحریر الشام اور کرد ملیشیا جیسے نان اسٹیٹ ایکٹرز بھی سرگرم رہے ہیں جس کے نتیجے میں اِدھر اُدھر کے بہت سے ہتھیاروں کی آزمائش ہوتی رہی ہے۔

مشرقِ وسطیٰ میں ایک طرف بہت بڑے پیمانے پر فوجی و غیر فوجی جانی نقصان ہو رہا ہے، عمارتیں اور بنیادی ڈھانچا تباہ ہو رہا ہے جبکہ دوسری طرف متعدد ممالک ہتھیاروں کی آزمائش کر کے مال بنا رہے ہیں۔ اُن کے ہتھیاروں کی فروخت بڑھ رہی ہے۔ ہر بڑے ملک کے فوجیوں کو ریئل لائف تربیت درکار ہوتی ہے۔ وہ جب تک جنگ میں حصہ نہ لیں تب تک پتا نہیں چلتا کہ اُن کی مہارت کس حد تک ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کی جنگوں نے امریکا، روس اور دیگر ممالک کے فوجیوں کی مہارت کا گراف بلند کرنے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

اسرائیل نے کم و بیش دو عشروں کے دوران غزہ، لبنان اور شام کو اپنے فوجیوں کے لیے چاند ماری کے میدان (فائرنگ رینج یا ٹیسٹنگ گراؤنڈ) میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ بے دھڑک فائرنگ اور گولا باری کرتے ہیں، ٹینک دوڑاتے ہیں، میزائل چلاتے ہیں۔ امریکا نے چند سال قبل عراق پر بار بار فضائی حملے کر کے اپنے جدید ترین لڑاکا طیاروں کی کارکردگی آزمائی تھی۔ شام کی سرزمین کو روس نے بھی اپنے میزائلوں، توپوں اور رائفلز کے لیے فائرنگ رینج میں تبدیل کیا ہے۔

۱۹۹۰ء کے عشرے میں امریکا نے عراق کے خلاف خلیج کی پہلی جنگ کے بعد نئے ملینیم میں پہلی جنگ ایران کے خلاف چھیڑی تھی۔ درمیانی مدت میں وہ کبھی سکون سے نہیں بیٹھا۔ صومالیہ، یوگوسلاویہ، بوسنیا ہرزیگووینا، سربیا، سوڈان اور ایران میں امریکا نے اپنے ہتھیاروں کی آزمائش کو ترجیح دی ہے۔ ہر چھوٹی بڑی لڑائی میں امریکا اپنے ہتھیاروں کو آزما لیتا ہے، نیا تجربہ حاصل کرتا ہے، اُس کے فوجیوں کی اچھی عملی تربیت ہو جاتی ہے۔ امریکا واحد سپر پاور ہے اور اُس کے پاس سب سے بڑی اور سب سے منظّم جنگی مشین ہے۔ جدید ترین ہتھیار، لڑاکا طیارے اور ایٹمی آبدوزیں امریکا کے پاس

ہیں۔ یہ بات کوئی بھی سمجھ سکتا ہے کہ امریکا اسلحہ سازی کے میدان میں بہت آگے ہے۔ اُس نے اپنے صنعتی ڈھانچے کو اس طور تبدیل کیا ہے کہ اب وہ اسلحہ سازی کی صنعت کو پروان چڑھائے بغیر جی نہیں سکتا۔ امریکی معیشت کی کامیابی اور فروغ کے لیے لازم ہے کہ دنیا بھر میں جنگیں اور خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔

سابق امریکی وزیرِ خارجہ آنجہانی ہنری کسنجر نے ایک بار کہا تھا کہ اگلے ہفتے کوئی سفارتی بحران نہیں ہوسکتا کیونکہ میرا شیڈول بھر چکا ہے! سیدھی سی بات ہے، امریکا اور دیگر طاقتور ملک اپنی سہولت کے مطابق بحران پیدا کرتے ہیں اور اُن سے فائدہ بٹورتے ہیں۔ امریکا کے ایک اعلیٰ عسکری کمانڈر کا کہنا ہے کہ جنگوں میں امریکا کے جدید ترین لڑاکا طیاروں اور ایئر ڈیفنس سسٹم کی کارکردگی تکنیکی معاملات میں امریکا کی برتری ثابت کرتی ہے۔ فضائی لڑائی میں امریکا کے پائلٹ اور ڈیفنس سسٹم آپریٹر جدید ترین آلات کی مدد سے انتہائی مفید معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

امریکا نے اسرائیل کے ساتھ مل کر ۲۷ فروری کو ایران پر حملہ کیا مگر اِس سے بہت پہلے امریکی محکمۂ دفاع نے اسلحہ ساز اداروں سے کہہ دیا تھا کہ یہ ہنگامی حالت کا حکم ہے، ہتھیاروں اور گولا بارود کی پیداوار بڑھا دی جائے۔ ماہرین نے ہتھیاروں کو زیادہ کارگر بنانے کی کوششیں شروع کردیں۔ میدانِ جنگ میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے، اُس پر نظر رکھی جاتی ہے تاکہ اپنی غلطیوں اور خامیوں کا اندازہ ہوسکے۔ امریکی اسلحہ ساز اداروں کی مراد بر آئی۔ افغانستان اور عراق کے بعد ایران کا محاذ کھلنے پر ہتھیاروں کی آزمائش کا بہترین موقع ہاتھ آیا۔

امریکی فوج کے ایک ریٹائرڈ کمانڈر کا کہنا ہے کہ جنگ کی صورت میں کسی بھی ہتھیار کی خامیوں اور کمزوریوں کو جانچنے کا موقع ملتا ہے۔ جو ممالک جنگ میں حصہ لیتے ہیں یا دور سے تماشا دیکھتے ہیں، وہ ہتھیاروں کا جائزہ لے کر اُن کی نقل کرتے ہیں یا اُن ہتھیاروں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنگ میں کامیاب ہتھیاروں کی مارکیٹ ویلیو اور مارکیٹنگ بڑھتی ہے۔ جن ممالک کو لگتا ہے کہ اُن کی سلامتی زیادہ خطرے میں ہے، وہ امریکا اور دیگر بڑے طاقتور ملکوں سے جدید ترین ہتھیار خریدتے ہیں اور ہتھیاروں کے اِن خریداروں کے ہاں سلامتی کو لاحق خطرات بھی یہی طاقتور ممالک محسوس کراتے ہیں! حالیہ نام نہاد ایران جنگ میں بھی یوکرین میں استعمال کیے جانے والے ہتھیار اور جنگی ساز و سامان تھوڑے سے فرق کے ساتھ دیکھنے کو ملے ہیں۔

آج کی جنگ میں ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ مواصلاتی آلات بھی بڑے پیمانے پر استعمال ہو رہے ہیں۔ گلوبل پوزیشننگ سسٹم، راڈار اور ایسے ہی دیگر آلات فضائی جنگ میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ امریکا نے ایران کے خلاف جنگ چھیڑنے کے دو ہفتوں بعد کروز میزائلوں اور بمبار طیاروں کا استعمال گھٹا دیا۔ بری فوج سے بھی کام لیا گیا۔ کوشش کی گئی کہ فیلڈ کمانڈرز نئی مورچہ بندی کریں۔ امریکا نے اس جنگ سے جو نتائج حاصل کرنا تھے، کرلیے۔ امریکا نے خلیج کی پہلی جنگ میں عراق کے خلاف کروز میزائل بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیے تھے۔ یہ میزائل کم و بیش پوری قطعیت کے ساتھ پر ہدف پر پہنچتے تھے۔ تھوڑی بہت خامیاں دور کرنے کے لیے امریکی ماہرین نے ٹام ہاک کروز میزائل میں نیا نیویگیشن سسٹم متعارف کرایا۔ اِن میزائلوں کے آن بورڈ کمپیوٹرز بھی بہتر بنائے گئے تھے۔ ساتھ ہی کروز میزائلوں میں گولا بارود لے جانے کی صلاحیت بھی بڑھائی گئی۔ اب جدید ترین کروز میزائلوں کو آزمانا مقصود تھا تو نام نہاد ایران جنگ کا ڈراما رچایا گیا۔ برطانیہ نے بھی آبدوزوں سے کروز میزائل داغنے کی صلاحیت بہتر ہی نہیں بنائی بلکہ آزما بھی لی ہے۔

بہت کم لوگوں کو اِس بات کا علم ہے کہ امریکا، برطانیہ اور اسرائیل جیسے ممالک کسی بھی جنگ میں حصہ لینے والے اپنے لڑاکا طیاروں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے کارروائی کی وڈیو بھی بناتے ہیں۔ ان وڈیوز کا جائزہ لینے پر اُنہیں معلوم ہو پاتا ہے کہ کہاں کہاں کچھ کسر رہ گئی ہے۔ وڈیو بنانے کے لیے مصنوعی سیاروں سے بھی مدد لی جاتی ہے۔

امریکی محکمۂ دفاع کے حکام وڈیوز اور تصویروں کا جائزہ لے کر لڑائی کو طول دینے کی منصوبہ سازی کرتے ہیں۔ یا اگر لڑائی کو محدود کرنا، سمیٹنا ہو تو اُس طرف چل پڑتے ہیں۔ طے کیا جاتا ہے کہ کہاں سے فوج ہٹانی ہے، کہاں لگانی ہے۔ دشمن کی طاقت کے مراکز ختم کرنے کے لیے کسی بھی ملک کو جو کچھ کرنا چاہیے، وہ جنگ کے بصری شواہد کی روشنی میں طے کیا جاتا ہے۔

حالیہ جنگ کے دوران امریکی فوج کے لیے ایران کی سرزمین ایک وسیع تجربہ گاہ میں تبدیل ہوگئی۔ ہر ملک اپنی فوج کے لیے مشقوں کا اہتمام کرتا ہے تاکہ مہارت کا گراف بلند ہو۔ جدید ترین ہتھیاروں اور جنگی ساز و سامان سے لیس فوجی مشقوں کے ذریعے بہت کچھ سیکھتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ حقیقی لڑائی سے کوئی بھی فوجی بہت زیادہ سیکھتا ہے اور یہ سیکھا ہوا ہی کام آتا ہے۔ امریکا اپنی فوج کے لیے حقیقی لڑائیوں کا اہتمام کرتا رہتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ سیکھے اور دنیا پر حکمرانی کے لیے زیادہ سے زیادہ اہل ثابت ہوتی رہے۔

جنگ پسندی اب امریکی حکمراں طبقے کے مزاج کا حصہ بن چکی ہے کیونکہ یہ ہزاروں ارب ڈالر کا معاملہ ہے۔ امریکا پہلے تو جنگیں چھڑوا کر اپنے ہتھیار بیچتا ہے اور پھر تعمیرِ نو کے ٹھیکے بھی حاصل کرتا ہے۔ جنگ پسندی کی ذہنیت نے پورے مشرقِ وسطیٰ کو امریکی فوج کے لیے ٹیسٹنگ گراؤنڈ میں تبدیل کردیا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے چھوٹے اسلامی ملک آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور خانہ جنگیاں بھی ہوتی رہی ہیں۔ یہ تمام ممالک امریکا سے ہتھیار خریدتے رہتے ہیں۔ حالیہ نام نہاد ایران جنگ کے نتیجے میں بھی بحرین، اردون، سعودی عرب، قطر، مصر اور دیگر ممالک نے ایران کے ممکنہ حملوں سے بچنے کے لیے بہت بڑے پیمانے پر امریکا سے خریداری کی ہے۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ سے اب تک بڑی طاقتوں نے مشرقِ وسطیٰ کے ریگستان کو نئے ہتھیاروں کے ٹیسٹنگ گراؤنڈ میں تبدیل کردیا ہے۔ جب نئے ہتھیار تیار ہوتے ہیں تب بھی وہ خطرناک لگتے ہی ہیں مگر حقیقی لڑائی میں آزمائش کے بعد اندازہ ہو پاتا ہے کہ وہ کس حد تک کارگر ہیں۔

جب اسرائیلی پائلٹس نے عربوں پر حملے شروع کیے تو روس نے مصر کو سام سکس اور عراق کو سام سیون میزائل فراہم کیے۔ مصر نے ۱۹۷۳ء میں اِن میزائلوں کے ذریعے اسرائیل کے ۷۰ لڑاکا طیاروں کو مار گرایا تھا۔ روس میں یہ خبر بہت خوشگوار تاثر کی حامل ثابت ہوئی۔ روس کے اسلحہ ساز اداروں کے لیے یہ بڑی خوشخبری تھی کیونکہ اُن کے مال کی بڑے پیمانے پر خریداری شروع ہوئی۔

روس نے شام میں جاری خانہ جنگی کے دوران اپنے ہتھیاروں اور میزائلوں کی آزمائش کے بعد حاصل شدہ نتائج کی روشنی میں تیاری کرکے یوکرین پر لشکر کشی کی۔ شام میں روس کے جدید ترین کروز اور بیلسٹک میزائل کے علاوہ سخوئی ۳۴ اور سخوئی ۳۵ لڑاکا طیاروں کی بھرپور آزمائش کے بعد انہیں یوکرین میں جنگ کے دوران استعمال کیا گیا۔ روس نے ایران سے سیکڑوں ڈرون اور بیلسٹک میزائل لیے تھے۔ اس کے جواب میں روس نے وعدے کے باوجود ایران کو سخوئی ۳۵ لڑاکا طیارے اور ایس۔۴۰۰ ایئر ڈیفنس سسٹم اب تک نہیں دیے۔

ایران نے بھی شام کی جنگ میں اپنی ضرورت کے مطابق تجربہ سمیٹا تھا۔ اس جنگ سے ایرانی فوج (پاسدارانِ

انقلاب) اور لبنان میں ایرانی پراکسی حزب اللہ ملیشیا کو جدید ترین ہتھیاروں اور جنگی ساز و سامان سے متعلق تکنیکی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ یہی نہیں، شام میں استعمال ہونے والے زمین سے زمین پر مار کرنے والے ایم-۶۰۰ میزائلز کی بنیاد پر ایران نے فتح-۱۱۰؍میزائل تیار کیے۔

امریکا اور روس نے ایک زمانے سے مشرقِ وسطیٰ کو اپنے لیے چاند ماری کا میدان بنا رکھا ہے۔ روس نے سام میزائل شام اور مصر کو دیے تو امریکا نے اسرائیل کو ٹام ہاک میزائل فراہم کیے۔ اِس کے جواب میں روس نے ٹینک شکن میزائل ''اسپنز'' مارکیٹ میں متعارف کرائے۔ اِن میزائل کی مدد سے عربوں نے اسرائیل کی ۳۰۰ صحرائی بکتر بند گاڑیاں تباہ کردی تھیں۔ امریکا نے اپنا ٹینک شکن میزائل ''میورک'' ۱۹۷۳ء کی جنگ میں آزما لیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ میں امریکا نے اپنے ٹام ہاک اور پیٹریاٹ میزائل بھی آزما لیے۔ پاکستان نے امریکا سے ''سائڈ وائنڈر'' میزائل حاصل کیے ہیں۔ یہ میزائل مصر اور اسرائیل کے درمیان صحرائے سینا کے علاقے میں آزمائے جاچکے ہیں۔ میورک میزائلوں کے ذریعے اسرائیل نے عرب ممالک کے ۱۵۰؍لڑاکا طیاروں اور ۸۰۰ صحرائی بکتر بند گاڑیوں کا کباڑا کردیا تھا۔

ایران کے خلاف امریکا نے ٹام ہاک میزائل کا نیا ورژن بھی آزمایا ہے۔ بنکرز توڑنے والے بم اور میزائل بھی اس جنگ میں دل کھول کر استعمال کیے۔ امریکا کے لیزر گائڈڈ میزائل ۳۱ فٹ کی گہرائی تک گُھس کر پھٹ سکتے ہیں۔

عشروں تک روس کا ایک بنیادی طریقِ کار یہ رہا ہے کہ جب بھی وہ کوئی نیا ہتھیار تیار کرتا ہے، کسی بھی عرب ملک کو خاصی کم قیمت پر فراہم کرتا ہے۔ جلد یا بہ دیر جنگ یا خانہ جنگی تو ہونی ہی ہے، ہتھیاروں اور جنگی ساز و سامان کی آزمائش ہوجائے گی۔

پہلی خلیجی جنگ کے دوران روسی ساختہ اسکڈ میزائلوں کی آزمائش ہوئی تھی جو عراق کو فراہم کیے گئے تھے۔ دوسری طرف امریکا نے اسرائیل کو پیٹریاٹ میزائل فراہم کیے۔ فرانس نے عراق کو جدید ترین راڈار فراہم کیے تھے۔ اِن کی بھی آزمائش ہوگئی۔ اس جنگ میں امریکا نے عراق کے خلاف کئی طرح کے بمبار طیاروں کو خوب آزمایا۔ اِن میں ایف-۱۱۷؍اسٹیلتھ بمبار، اے-۱۰؍تھنڈر بولٹ اور بی-۲ بمبار شامل تھے۔

خلیج کی پہلی جنگ میں فرانس نے بھی اپنے میراج-۲۰۰۰ طیاروں کا نیا اسکواڈرن میدان میں اتارا تھا۔ اس طیارے میں نیا ایویانکس سسٹم نصب کیا گیا تھا۔ کویت کی سرزمین پر امریکا نے طیارہ شکن ٹام ہاک میزائل بھی نصب کیا تھا۔ اس جنگ میں عراق کو اپنے لڑاکا طیارے اڑانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ یوں امریکا ٹام ہاک میزائلز کی کارکردگی کا اندازہ ہی نہ لگا سکا۔

امریکا نے اسرائیل کو ۲۰۲۰ء میں نئے ڈیزائن کیے ہوئے ایف-۳۵ لڑاکا طیارے فراہم کیے۔ یہ جدید ترین طیارے حاصل کرنے والا اسرائیل پہلا ملک تھا۔ اس میں بھی امریکا کا مفاد نمایاں تھا۔ اسرائیلی فضائیہ کے پاس انتہائی باصلاحیت پائلٹ ہیں۔ امریکا چاہتا تھا کہ جدید ترین لڑاکا طیاروں کی اچھی آزمائش ہوجائے۔ اسرائیل نے شام میں ایرانی فوجی ٹھکانوں پر بمباری کے لیے اِن طیاروں کو خوب استعمال کیا۔ اسرائیلی پائلٹس نے امریکی دفاعی حکام کو اِن طیاروں میں رہ جانے والی خامیوں اور کمزوریوں کے بارے میں بتایا۔ امریکی محکمۂ دفاع نے اِن لڑاکا طیاروں کو بہتر بنایا اور اسرائیل کو نئے اسکواڈرن فراہم کیے۔

پانچ عشروں کے دوران کم و بیش ہر وقت حالتِ جنگ سے دوچار رہنے والے اسرائیل نے قطعیت کے ساتھ مار کرنے والے ہتھیار اور میزائل تیار کیے ہیں۔ فلسطین اور لبنان سے کئی بار لڑنے والے اسرائیل نے جاسوسی کا بھی غیر معمولی نظام تیار کیا ہے۔

دشمن ملکوں اور علاقوں پر حملوں کے لیے پیگاسس سوفٹ ویئر اور مصنوعی ذہانت کی مدد سے اسرائیل نے جاسوسی کا نیا میکینزم تیار کیا ہے۔ اسرائیل نے غزہ کو بھی اپنے ہتھیاروں اور جنگی ساز و سامان کے ٹیسٹنگ گراؤنڈ میں تبدیل کرلیا ہے۔ مختلف لڑائیوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تجربے کی مدد سے جدید ترین ہتھیار تیار کر کے برآمد بھی کرتا ہے۔

حالیہ ایران جنگ کے دوران اسرائیل کو غیر معمولی کڑوے گھونٹ پینا پڑے کیونکہ اُس کا فضائی دفاعی نظام زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوا۔ اس سسٹم کا نام آئرن ڈوم ہے۔ کلسٹر بموں کے استعمال پر ۱۰۰؍ملکوں نے پابندی عائد کردی ہے تاہم ایران نے اس جنگ کے دوران اسرائیل پر کلسٹر بم برسائے جن سے آئرن ڈوم کی چُولیں ہل گئیں۔

امریکا نے خلیج کی پہلی جنگ میں جس لڑاکا طیارے کو استعمال نہیں کیا تھا، اُسے ایران کے خلاف حملوں کے لیے بھی استعمال کیا۔ امریکی فوج نے اے سی-۱۳۰ گن شپ طیاروں کے ذریعے ایران پر موت برسائی۔ اس طیارے کو ''اسپوکی ٹو'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس طیارے کی فائر پاور غضب ناک ہے۔ یہ اپنے ہدف کی طرف بہت نیچی پرواز بھی کرسکتا ہے۔ گولے داغنے کے لیے اِس میں کمپیوٹر سے کنٹرول کی جانے والی تین توپیں نصب ہیں۔ امریکی فضائیہ نے ہرکیولیس طیارے کو اے سی-۱۳۰ لڑاکا طیارے میں تبدیل کیا۔

امریکا نے ایران کے خلاف حالیہ جنگ میں LUCAS (لوکاسٹ انکریوڈ کامبیٹ اٹیک سسٹم) نامی خودکش ڈرون استعمال کیے جو ایران کے شاہد ۱۳۶؍ڈرون کی کاربن کاپی ہے۔ یہ ڈرون طویل فاصلے تک پرواز کرتے ہوئے اپنے ہدف پر عقاب کی طرح جھپٹتا ہے۔ امریکی دفاعی حکام کی سمجھ میں یہ بات بہت دیر سے آئی کہ کروڑوں ڈالر کے کروز اور بیلسٹک میزائل سے جو کام لیا جاتا ہے، وہی کام محض ۳۵ ہزار ڈالر مالیت کے ڈرون اٹیک سسٹم سے بھی لیا جاسکتا ہے۔

ایران نے ۲۰۱۱ء میں ایک جھڑپ کے دوران امریکا کا یو ایس آر کیو-۱۷۰؍سینٹینل سرویلنس ڈرون پکڑا تھا۔ اِس ڈرون میں استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی کی بنیاد پر ریموٹ کنٹرولڈ ڈرون تیار کیے۔

بھارت سمیت متعدد ممالک نے ایران جنگ کا باریک بینی سے جائزہ لیا تاکہ اپنی اسلحہ سازی کی صنعت کچھ نیا سوچ جاسکے۔ یہ بات تو اب سبھی تسلیم کرچکے ہیں کہ بہت کم خرچ کرکے، ڈرونز کے ذریعے کیے جانے والے حملوں سے دشمن کو بہت زیادہ نقصان پہنچانا ممکن ہے۔ آپریشن سیندور کے بعد بھارت نے ڈرون سسٹم پر زیادہ توجہ دی ہے۔ جنگ میں استعمال ہونے والے ڈرون بہت تیزی سے بہت بڑی تعداد میں تیار کیے جاسکتے ہیں۔ (مترجم: ابوصباحت)

(بحوالہ: ''گجرات سماچار''، احمد آباد، بھارت۔ ۵؍اپریل ۲۰۲۶ء)

◆

بقیہ: غزہ نسل کشی: بھارت کا گھناؤنا کردار

سالہا سال سے، اسرائیل کے ساتھ بھارت کے تعلقات پر بات چیت صرف سربراہی اجلاسوں، انٹلی جنس تعاون، میزائل سودوں اور اقوام متحدہ میں ووٹنگ کے پیٹرن تک محدود رہی۔ لیکن ایمنسٹی کی اس رپورٹ نے اس گفتگو کا رخ اب فیکٹریوں، مشین شاپس، ڈھلائی کے کارخانوں، کسٹمز دفاتر اور شپنگ مینوفیسٹس کی طرف موڑ دیا ہے۔

نیتن یاہو کا یہ تبصرہ کہ بھارت، اسرائیل کے مضبوط ترین حامیوں میں سے ایک ہے، بظاہر ایک سفارتی تعریف ہے، مگر یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ بھارت اسرائیل کی پیداواری لائنوں، برآمدی کھیپوں اور دفاعی سپلائی چین کا حصہ بن چکا ہے۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۵؍اگست ۲۰۲۶ء)

سوئیڈن کو تو ہوش آگیا

ابو صباحت

زمانہ آسانیوں کا ہے اور آسانیاں بھی ایسی کہ قیامت ہی ڈھایا کریں۔ ایک زمانے سے جن آسانیوں اور سہولتوں کے خواب دیکھے جارہے تھے، وہ اب حقیقت کا روپ دھار چکی ہیں مگر اِس کے نتیجے میں ہمارے فکر و نظر کا رنگ روپ کچھ کا کچھ ہوگیا ہے۔ مصنوعی ذہانت کا دَور کیا شروع ہوا ہے، ہر طرف صرف آسانیوں کو گلے لگایا جارہا ہے۔ لوگ اپنے معاشی اور پیشہ ورانہ مہارت کے معاملات میں بھی مصنوعی ذہانت سے اِس قدر کام لے رہے ہیں کہ دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور خوف بھی آتا ہے۔ مصنوعی ذہانت نے ڈیجیٹل دُنیا کو حقیقی معنوں میں انقلاب آمیز ہی نہیں، انقلاب پرَور بھی بنادیا ہے۔

کبھی کسی نے سوچا تھا کہ علم و فن کو اِس تیزی سے اور اِتنے بڑے پیمانے پر پھیلایا جاسکے گا۔ سائبر اسپیس نے انسان کے لیے وہ سب کچھ ممکن بنادیا ہے جو وہ سوچ سکتا ہے۔ کسی بھی بات کو اگر لاکھوں، کروڑوں لوگوں تک پہنچانا ہو تو ایسا کرنا چنداں دُشوار نہیں۔ ڈیجیٹل میڈیا کی مدد سے ایسا کرنا انتہائی آسان ہوگیا ہے اور بہت زیادہ خرچ بھی نہیں کرنا پڑتا۔

ہر شعبے کو ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ آسانیاں پیدا کی ہیں۔ جن شعبوں کو ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، اُن میں تعلیم بہت نمایاں ہے۔ دنیا بھر میں کروڑوں طلبہ اب علم کے حصول اور امتحان کی تیاری کے لیے مطبوعہ کتابوں کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ وہ ڈیجیٹل کتابوں سے کام لینے کے عادی ہوچکے ہیں۔ امریکا اور یورپ میں کارپوریٹ سیکٹر نے بھی اِس بات کو بڑھاوا دیا ہے کہ طلبہ ڈیجیٹل ذرائع سے زندگی بسر کرنا سیکھیں اور ہارڈ کاپی پر سوفٹ کاپی کو ہر حال میں ترجیح دیں۔ یہی سبب ہے کہ اب ترقی یافتہ ممالک کے طلبہ کے ہاتھوں میں کتابیں نہیں ہوتیں بلکہ صرف گیجیٹس ہوتے ہیں۔ وہ اینڈرائیڈ سیل فون اور دیگر آلات کی مدد سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اِسی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔

دنیا بھر میں تعلیم اور دیگر شعبوں کے ماہرین نے کہا ہے کہ مطبوعہ کتابوں کو زندگی سے نکال دینے کے نتیجے میں بہت زیادہ خرابیاں پیدا ہوں گی۔ وہ ڈیجیٹل ذرائع کی مدد سے پڑھنے کو بُرا نہیں کہتے مگر اُن کے خیال میں اِس کی ایک خاص حد ہونی چاہیے۔ طلبہ اگر لکھنے اور مطبوعہ کتابیں پڑھنے کی عادت نہیں ڈالیں گے تو اُن کی سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت شدید متاثر ہوگی۔ اور ایسا ہی ہوا ہے۔ دنیا بھر میں بچے ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی مدد سے پڑھ رہے ہیں، آن لائن ذرائع سے خوب مستفید ہو رہے ہیں مگر اِس کے نتیجے میں اُن میں بہت سی کمزوریاں پیدا ہوچلی ہیں۔ جسمانی پریشانی، نیند کی کمی اور انتشارِ فکر و نظر اپنی جگہ، مسئلہ یہ ہے کہ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے ذریعے پڑھنے اور آن لائن ذرائع سے استفادہ کرنے کی صورت میں بچے کُند ذہن ہوتے جارہے ہیں۔ وہ اسکرین کے غلام ہوکر رہ گئے ہیں۔

کلاس روم میں ترقی یافتہ ملکوں کے بچّے جو کچھ پڑھتے ہیں، وہ ورچوئل دنیا میں ہوتا ہے یعنی حقیقی دنیا میں اُس کا وجود نہیں ہوتا۔ مطبوعہ تدریسی مواد اِس قدر گھٹ گیا ہے کہ اِسے اب ناپید ہی سمجھئے۔ بچّوں کی زندگی سے ہارڈ کاپی نکلی ہے تو سوفٹ کاپی نے زندگی کو ہارڈ بنا ڈالا ہے۔ ایسے میں بہت سے بچوں کے لیے اچھی طرح تعلیم پانا بہت حد تک ڈائی ہارڈ قسم کا معاملہ ہوگیا ہے۔ وہ بہت کچھ پڑھتے ہیں مگر سمجھ نہیں پاتے اور یاد بھی نہیں رہ پاتا۔ لکھنے کی عادت تقریباً ختم ہی ہوچکی ہے۔ ٹائپنگ کی صلاحیت نے زندگی کے لازمی جُز کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔

تعلیم و تعلّم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے ماہرین اِس بات پر زور دے رہے ہیں کہ بچوں کو مطبوعہ مواد سے استفادہ کرنے کی بھی تحریک دی جائے کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اُن کا حافظہ کمزور پڑتا جاتا ہے۔ بات بات پر سیل فون اٹھا کر گوگل کے ذریعے کچھ معلوم کرنے کی عادت نے ذہن کو ڈھنگ سے بروئے کار لانے کی ضرورت کو کم و بیش نہ ہونے کی منزل تک پہنچا دیا ہے۔

بہت سے ملکوں میں اب مطبوعہ مواد سے استفادہ کرنے کے بارے میں سوچا جارہا ہے۔ کلاس روم میں ڈیجیٹل کتابوں کے بجائے مطبوعہ کتابوں کے ذریعے تدریس کا سلسلہ شروع کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ اس معاملے میں سوئیڈن پہل کرگیا ہے۔ اُس نے ملک بھر کے کلاس رومز کی اوور ہالنگ کا فیصلہ کیا ہے۔ کلاس رومز میں ٹیبلیٹس اور دیگر اسکرین کے بجائے مطبوعہ کتابیں فراہم کی جائیں گی۔ تمام طلبہ کو پابند کیا جائے گا کہ وہ مطبوعہ کتابوں کے ذریعے پڑھیں تاکہ ایک طرف تو اُن کا حافظہ تیز ہو اور دوسری طرف اُن میں سوچنے، سمجھنے اور اپنی بات ڈھنگ سے کہنے کی صلاحیت پروان چڑھے۔ تمام کلاسوں میں مطبوعہ کتابیں فراہم کرنے کے لیے سوئیڈن کی حکومت نے ۱۰ارکروڑ یورو مختص کیے ہیں۔ حکومت کا کہنا ہے کہ ماہرین کی آرا کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی مدد سے اور آن لائن پڑھنے کی صورت میں انہماک یقینی بنانے کی صلاحیت خطرناک حد تک متاثر ہوچکی ہے۔ کم و بیش ایک عشرے تک ’’ڈیجیٹل فرسٹ‘‘ کی پالیسی اپنائی گئی مگر اب سوئیڈش حکومت کو اچھی طرح اندازہ ہوچکا ہے کہ ایسا کرنا غلط تھا اور اب بھی وقت ہے ہوش کے ناخن لیے جائیں۔ سوئیڈن وزارتِ تعلیم کا کہنا ہے کہ تحقیق سے ثابت ہوچکا ہے کہ اسکرین کا بہت زیادہ استعمال انسان کو انہماک یقینی بنانے کی صلاحیت سے دُور کرتا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بچے پوری توجہ سے پڑھ نہیں پاتے اور مواد کو سمجھنے میں بھی اُنہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تخلیقی انداز سے سوچنے کے قابل بھی نہیں رہتے۔

تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ چمکتی ہوئی یا روشن اسکرین پر پڑھنے سے ذہن پر زیادہ دباؤ پڑتا ہے۔ مطبوعہ کتابیں یعنی ہارڈ کاپی کے ذریعے پڑھنے کی صورت میں ذہن کے بھٹکنے کا امکان کم ہوتا ہے، ذہن پُرسکون رہتا ہے اور ایک سیدھی راہ پر ذہن کو چلاتے رہنا محض ممکن ہی نہیں بلکہ قدرے آسان بھی ہوتا ہے۔ حالیہ برسوں کے دوران سوئیڈن میں بچوں کے امتحانی نتائج توقعات سے بہت کم رہے ہیں۔

نئے منصوبے کے تحت طلبہ کو تمام مضامین کی مطبوعہ کتابیں دی جائیں گی۔ ڈیجیٹل ذرائع معاونت کے لیے موجود اور دستیاب رہیں گے۔ ہاں، اُنہیں تدریس میں مرکزی حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ سوئیڈش حکومت تعلیم میں ٹیکنالوجی کے کردار پر نظرِ ثانی کر رہی ہے۔ یہ بات وہ سمجھ چکی ہے کہ ٹیکنالوجی سے مدد لی جاسکتی ہے، پورے وجود کو اُن کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا بھر میں یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ اسکرین تیزی اور آسان رسائی ممکن بناتی ہے مگر ذہن کو یکسو رکھنے اور حافظہ بڑھانے کے لیے ہارڈ کاپی ہی زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہے اور اُن کی مدد سے پڑھنے کی صورت میں انہماک یقینی بنانا اور برقرار رکھنا بھی قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ پکسلز پر کاغذ کو ترجیح دے کر سوئیڈن نے کلاس روم کے متوازن اور باخبر و باشعور مستقبل کو یقینی بنانے کی سمت اہم قدم بڑھایا ہے۔ اِس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ڈیجیٹل ٹرینڈز کو اندھا دُھند اپنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

◆ ◆ ◆

جموں و کشمیر اور جزائرِ اَولند

ڈاکٹر غلام نبی فائی

گزشتہ دنوں ایک یورپی شخصیت سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے ملاقات کے دوران جو کچھ کہا، اُس سے مجھے جموں وکشمیر اور جزائرِ اولند کے درمیان موازنے کی تحریک ملیاً یہ دونوں متنازع علاقے غیر معمولی مماثلت رکھتے ہیں۔

کہتے ہیں تاریخ ہمیشہ خود کو دہراتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے مگر ہاں، اِتنا ضرور ہے کہ تاریخ بہت سے معاملات میں معقول اور کارگر موازنہ کرنے کی تحریک ضرور دیتی ہے۔ جزائرِ اولند (Åland Islands) اور جموں وکشمیر کے درمیان مشترکہ معاملات کی تلاش سے ہمیں ایک دیرینہ پیچیدہ مسئلے کے حل کی راہ تلاش کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

جموں وکشمیر کے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے ہمیں نئے سرے سے کوششیں شروع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ کیا جا چکا ہے، اُسی کا جائزہ لے کر، تجزیہ کر کے معقول حل تلاش کرنے کا سفر شروع کیا جا سکتا ہے۔ جدید تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بہت سے جغرافیائی معاملات خاصی عدمِ جامعیت کے ساتھ طے کرنے کی کوشش کی گئی مگر پھر وقت نے معاملات کو درست کرنے کی راہ سُجھائی اور مقامی باشندوں نے بھرپور دلچسپی لے کر اپنے لیے راہ نکالی۔ متنازع علاقوں کے باشندوں کی خود مختاری، سلامتی، امنگوں اور بنیادی حقوق کے لیے بہت کچھ کرنے کی تحریک مل سکتی ہے مگر اُس وقت جب کچھ مثبت انداز سے سوچا اور کیا جائے۔ اِس سلسلے میں فِن لینڈ اور سویڈن کے درمیان پائے جانے والے جزائرِ اولند کے تنازع سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے کیونکہ اِس معاملے کو خاصی خوش اُسلوبی سے نپٹایا گیا ہے۔

بہ نظرِ غائر دیکھیے تو جزائرِ اولند اور جموں وکشمیر میں کوئی مماثلت دکھائی نہیں دیتی۔ جزائرِ اولند بحیرۂ بالٹک میں واقع ہیں جبکہ جموں وکشمیر کا خطہ ہمالیہ کے دامن میں ہے۔ دونوں خطوں کی تزویراتی حیثیت بہت اہم ہے اور اِس کے نتیجے میں قومی شناخت کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ دونوں ہی معاملے نے اِس قدر اہمیت حاصل کی ہے کہ یہ سوال بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ یہ معاملہ محض دو طرفہ یا علاقائی رہنا چاہیے یا اِسے عالمی برادری کا مسئلہ گردانا جانا چاہیے۔

فِن لینڈ صدیوں تک سویڈن کی ریاست یا سلطنت کا حصہ رہا۔ فِن لینڈ اور سویڈن کے لوگ اگرچہ مشترکہ سیاسی شناخت کے امین تھے مگر دونوں کی تاریخ، زبان اور ثقافت میں فرق تھا۔ دونوں قومیّتوں کے لوگوں کے تعلقات اُس وقت بگڑے جب ۱۸۰۹ء میں سویڈن نے ٹریٹی آف فریڈرکشیم کے ذریعے فِن لینڈ کی سرزمین کو روس کے حوالے کر دیا۔ اِس معاہدے کی رُو سے فِن لینڈ کا پورا خطہ روسی ریاست کی حدود میں ایک خود مختار علاقہ بن گیا۔ دوسری طرف اِس نئے معاہدے کے تحت جزائرِ اولند بھی نئی سیاسی تطبیق کا حصہ بنے۔

۱۹۱۷ء میں روسی سلطنت کے زوال نے پورے خطے کو بدل کر رکھ دیا۔ فِن لینڈ نے آزادی کا اعلان کیا اور سویڈش بولنے والے جزائرِ اولند کے ۹۵ فیصد باشندوں نے سویڈن کے حق میں رائے دی کہ وہ دوبارہ سویڈن کا حصہ بننا چاہتے تھے۔

فِن لینڈ نے یہ مطالبہ مسترد کرتے ہوئے کہا کہ یہ معاملہ اب بین الاقوامی نوعیت سے محروم ہو کر اندرونی معاملہ بن چکا ہے۔ برطانیہ نے فِن لینڈ کا یہ مؤقف تسلیم نہیں کیا اور معاملے کو لیگ آف نیشنز کے سامنے رکھا جو اُس وقت اقوامِ متحدہ کی سی شکل کا ادارہ تھا۔ برطانیہ کا مؤقف یہ تھا کہ متنازع معاملات کو خوش اُسلوبی سے نہ نپٹایا گیا تو عالمی امن کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ قانون دانوں کے ایک کمیشن نے غور و خوض کے بعد کہا کہ یہ معاملہ اب فِن لینڈ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو چکا ہے اور اِسے عالمی برادری ہی ڈھنگ سے نپٹا سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ لیگ آف نیشنز نے جزائرِ اولند کا کنٹرول فِن لینڈ کو سونپ تو دیا مگر ساتھ ہی ساتھ اُسے وہاں کے باشندوں کی نسلی، لسانی اور ثقافتی شناخت کا تحفظ اور سیاسی خود مختاری یقینی بنانے کی ذمہ داری بھی سونپی۔ اس پورے خطے کو غیر عسکری بھی بنانا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی فریق کے من کی مراد پوری نہیں ہوئی مگر اِس کے باوجود ایک صدی سے بھی زائد مدت کے دوران جزائرِ اولند کے لوگ ڈھنگ سے جی رہے ہیں اور عالمی سطح پر اِس معاملے کو سفارت کاری کے ذریعے تنازعات نپٹانے کی ایک اچھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

جموں وکشمیر کے معاملات بھی کچھ ایسے ہی سوال کھڑے کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک پاکستان اور بھارت جموں وکشمیر پر اپنا اپنا استحقاق جتاتے آئے ہیں اور ایک زمینی حقیقت یہ بھی ہے کہ خود اِس خطے کے لوگ پاکستان یا بھارت کی خواہشات اور امنگوں سے ہٹ کر کچھ چاہتے ہیں۔ کشمیر کے مسئلے نے دونوں ملکوں کو کئی جنگوں میں دھکیلا ہے، عسکری سطح پر بحران پیدا کیے ہیں اور ایٹمی ہتھیاروں کی حامل دو ریاستوں کے درمیان شدید عدمِ استحکام کا سبب بنتا رہا ہے۔

بھارت تواتر سے یہ دعویٰ کرتا آیا ہے کہ جموں وکشمیر اُس کا اندرونی معاملہ ہے اور اِسے ۱۹۷۲ء کے شملہ سمجھوتے کے تحت پاکستان اور بھارت کو مل کر طے کرنا ہے یعنی اِس کا عالمی برادری سے کوئی تعلق نہیں۔ پاکستان کا مؤقف یہ رہا ہے کہ جموں وکشمیر کا معاملہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں طے کیا جانا چاہیے اور اِس کا جو بھی حل تلاش کیا جائے، اُس میں کشمیریوں کی دِلی امنگوں کی عکاسی بھی ہونی چاہیے۔ باہم متصادم سیاسی اور قانونی بیانیوں نے اِس مسئلے کے معقول و بامعنی حل کی راہ میں تواتر سے رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔

حالیہ بحرانوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ حل طلب مسئلہ جنوبی ایشیا سے ہٹ کر بھی اپنے واضح اثرات رکھتا ہے۔ اپریل ۲۰۲۵ء میں پہلگام میں سیاحوں پر حملے نے دونوں ملکوں کو ایک بار پھر آمنے سامنے لا کھڑا کیا۔ اِس سے عالمی برادری کو ایک بار پھر یہ جاننے کو ملا کہ کشمیر ایک بہت بڑا فلیش پوائنٹ ہے یعنی یہاں سے کوئی بھی جنگ کسی بھی وقت چِھڑ سکتی ہے۔

جزائرِ اولند کا سبق یہ ہے کہ جموں وکشمیر کے خطے کو ویسا ہی انجام ملے یہ لازم نہیں۔ دونوں خطوں کے سیاسی حالات و واقعات، قانونی ڈھانچے اور تقاضے جغرافیائی و سیاسی حقیقتیں بالکل الگ ہیں۔ پیغام یا سبق یہ بھی ہے کہ طویل مدت تک عالمی برادری کے لیے پریشانی کا باعث چلے آ رہے تنازعات لازمی طور پر خود مختاری کے پنجرے میں بند نہیں رہنے چاہئیں۔ جہاں یک طرفہ نوعیت کی پالیسیاں ناکامی سے دوچار ہو چکی ہیں، وہاں عالمی برادری سے مدد لے کر سفارت کاری کو موقع دینے اور وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کے مؤقف کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کرنے کی صورت میں بہتری کی راہ ہموار ہو سکتی ہے، جموں وکشمیر کے تنازع کا کوئی جامع اور سب کے لیے قابلِ قبول حل نکالا جا سکتا ہے۔

جموں کو کشمیر کے مسئلے کا کوئی بھی جامع اور پائیدار حل تلاش کرتے وقت دونوں ملکوں کو لاحق سلامتی کے معاملات اور متنازع علاقے کے باشندوں کی خواہشات اور امنگوں کو بھی ذہن نشین رکھنا ہوگا۔ حقیقی اور پائیدار امن محض فوجی کنٹرول یا آئینی تبدیلیوں کے ذریعے ممکن نہیں بنایا جا سکتا۔ اور تمام ہی حقیقی اسٹیک ہولڈرز سے جامع مذاکرات کے بغیر بھی کوئی جامع حل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔

باقی صفحہ نمبر ۶

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950